جلد پنجم

المعلم

ماہ فروردی ۱۳۳۸ ف

محمد سجاد مرزا ایم اے [illegible]

اعظم اسٹیم پریس چادرگھاٹ حیدرآباد
(دکن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مندرجات المعلم

جلد (۵)	بابتہ ماہ فروری ۱۳۴۸ف	نمبر (۵)

فلسطین میں معلمات کی تربیت

ایک نو آباد ملک کے تعلیمی مسائل کو آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنے کے قبل میں یہ واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میرا مضمون صرف عرب لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق ہے چونکہ فلسطین کا سرکاری محکمۂ تعلیم ابھی یہودی بچوں کی تعلیم کا بلا راست ذمہ دار نہیں ہوا ہے

فلسطین ایک ننھا سا ملک ہے جو ویلز سے کسی قدر بڑا ہے لیکن چونکہ یہاں کی آبادی شہری
اور دیہی دو طبقوں پر منقسم ہے اور ان طبقوں کی ضروریات ایک دوسرے سے بالکل
مختلف ہیں اس لئے یہاں کی تعلیم میں اکثر دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دیہی زندگی کا محور
زراعت اور گلہ بانی ہے اور شہری زندگی کا ملجا و ماوا کاروانی تجارت ۱۹۱۹ء میں انگریزی قبضہ
کے وقت یہاں کے شہروں میں ترکوں کے قائم کردہ چند مدارس نسواں تھے لیکن ان
مدارس کے لئے تربیت یافتہ معلمات نام کو نہ تھیں اس لئے ہمارا سب سے پہلا کام یہ تھا
کہ مدارس نسواں کے لئے جن کی ملک میں عام طور پر ضرورت ظاہر کی جا رہی تھی استاد
فراہم کرنے کی غرض سے ایک قسم کا تربیتی مدرسہ قائم کریں۔ یہاں سے ہمارے پہلے مسئلہ
کی ابتدا ہوتی ہے جو فرقہ اور مذہب سے متعلق ہو۔

فلسطین کے باشندے اب فلسطینی کہلاتے ہیں یہ ایک وسیع اصطلاح ہے جو نہ
صرف دیہات اور صحرا کے ایسے خالص عربی اصل اشخاص پر حاوی ہے جن کا طرز زندگی
حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے اب تک نہیں بدلا بلکہ اس میں وہ مخلوط النسل عرب بھی شامل ہیں
جو گذشتہ (۲۰۰۰) سال کے عرصہ میں فاتحین کے ساتھ آئے یا دوسرے ممالک سے آکر
بس گئے ہیں۔ ان لوگوں کے مختلف مذاہب نے بھی ایک خاص مسئلہ کی بنیاد ڈالی ہے۔
اگر عربوں کا زیادہ تر حصہ مسلمان ہے لیکن عیسائی عربوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور
اور میرے خیال میں دنیا کے کسی حصہ میں مشرقی اور مغربی عبادت گاہوں کو باہمی مخالفت
اس مقدس مقام سے بڑھ کر اور کہیں نہیں ہے حالانکہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ وہ
مقام ہے جہاں سے ہم مختلف فرقوں کو مذہبی نعش کے اطراف یک جا پاتے ہیں۔
تربیتی مدرسہ کے قیام کے وقت ہمیں مختلف درجہ اور مذہب کے لوگوں کو ایک
سائبان کے تلے جمع کرنے کی دقت کا مقابلہ کرنا پڑا میرے خیال میں یہ صرف منشوری
حکومت کے روادارانہ طرز عمل پر لوگوں کے اعتماد کا نتیجہ تھا کہ ہماری تجویز کامیاب ہو سکی۔

ہم ہر طالب علم کو اوس کے اپنے مذہب کی تعلیم دینے کی کوشش کرتے ہیں ۱۹۱۵ء میں
جب ہم نے اس کام کو شروع کیا تھا تو ہم کو عیسائی لڑکیاں بکثرت ملتی تھیں جس کی وجہ
یہ تھی کہ وہ مقابلتاً آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھیں اور مشن اسکول کی وقتاً فوقتاً
حاضریوں کی بدولت اونہیں گھر کی خلوت گزینی ترک کرنے کی عادت پڑ گئی تھی مسلمان
لڑکیاں بہت مشکل سے ملتی تھیں صرف غرباء کی لڑکیوں یا محتاج یتیموں ہی کو اقامتی مدارس
پر شریک ہونے پر مجبور کیا جا سکتا تھا اور انہیں بچوں کو پڑھا کر روزی پیدا کرنے کی غرض
سے تربیت دیجاتی تھی۔ ایسی صورتوں میں ان لڑکیوں کا آخری مقصد صرف تنخواہ پانے کی
توقع ہوتی تھی اونہیں پیشہ کا شوق نہ تھا لیکن اب یہ بدظنی بتدریج کم ہوتی جارہی ہے چنانچہ
گذشتہ ماہ امتحان کے امتحان میں (۲۱) جائدادوں کے لئے (۹۶) درخواستیں وصول
ہوئیں جن میں (¾) درخواستیں مسلمان لڑکیوں کی تھیں اور اب ہمارے (۶۶) طالبات
میں مسلمان لڑکیوں کی تعداد اوس نسبت کے مطابق ہے۔

امیدواروں کے انتخاب کے لئے بہترین طریقوں کا تعین ہمارے دوسری دقت
ہے۔ لڑکیوں کے لئے سرکاری طور پر ثانوی تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ ہم ابھی ابتدائی
درجہ میں ہیں جب لڑکی (۱۴) یا (۱۵) سال کی عمر میں ابتدائی مدارس کا نصاب ختم کر چکتی
ہے تو اس کا تصفیہ کرنا ناممکن ہوتا ہے کہ وہ کامیاب معلمہ بن سکے گی یا نہیں اور اکثر
اوقات ناقابل لڑکیوں کو تربیتی نصاب کی تکمیل کے قبل ہی مدرسے نکال دینے کی
ضرورت لاحق ہوتی ہے اس خیال سے کہ حکومت آئندہ مالی نقصان سے محفوظ رہے ہم نے
اب یہ تجویز کی ہے کہ اب لڑکیوں کی شرکت پر دو سال کی غرض مدت کے لئے سالانہ ۲۱
پونڈ نہیں لی جائے اور اگر اس کی رفتار ترقی اچھی ہے تو فیس معاف کردی جائے۔

دوسرا مسئلہ جو حل طلب یہ ہے کہ دیہی اور شہری مدارس کی ضروریات کی
پابجائی ہم کس طرح سے کرسکتے ہیں شہری مدارس سے بیلکر ۱۵ سال کی عمر کی

لڑکیوں کو پڑھاتے ہیں۔ ان میں چھ جماعتیں ہوتی ہیں جن میں سے پہلی دو کنڈرگارٹن کے اصول پر کام کرتی اور لڑکیوں کو آئندہ تعلیم کے لئے تیار کرتی ہیں۔

ٹریننگ کالج کا چار سالہ نصاب جو کنڈرگارٹن یا معلمی سے متعلق ہوتا ہے ختم کر لینے کے بعد اکثر طالبات شہری مدارس میں کام کرنے کی خواہش کرتی ہیں۔ دیہی مدرسہ کا کام بالکل مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔ یہاں مختلف عمروں کی پچاس لڑکیاں ایک ہی کمرہ میں اور ایک ہی معلمہ کے زیر تعلیم ہوتی ہیں جس کی وجہ سے معلمہ کا کام ہر قلی ہوتا ہے دور دراز دیہاتوں کو بہت کم لڑکیاں جانا پسند کرتی ہیں۔ عیسائی لڑکیاں مسلم دیہاتوں میں نہیں بھیجی جاسکتیں اور مسلم لڑکیاں اوس وقت تک کہیں نہیں جاتیں جب تک کہ وہاں اون کا کوئی عزیز نہیں ہوتا جس کے پاس وہ رہ سکیں۔

ظاہر ہے کہ دیہی مدارس کا نصاب شہری مدارس کے نصاب سے بالکل مختلف ہونا چاہئیے۔ دیہات میں بے علمی۔ بیماری اور غلاظت (جو خصوصاً قلت آب کی وجہ سے ہوتی ہے) کو دور کرنے کی جد وجہد کرنی پڑتی ہے اور لڑکیوں کو قانع اور بکار آمد زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کرنا پڑتا ہے اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک چھوٹے سے مدرسہ میں دو جداگانہ نوعیتوں کی تربیت کا کس طرح سے انتظام کیا جائے اس کا ایک حل تو یہ ہوسکتا ہے کہ دیہی معلماۃ کا ایک نصاب صرف تین سالہ رکھا جائے اور اس کے ساتھ ضمنی طور پر شہری معلماۃ کا دو سالہ نصاب شریک کیا جائے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لڑکیاں جن کی مالی حالت خراب ہوتی ہے چھوٹے نصاب کو زیادہ پسند کریں گی۔

تنخواہوں کا مسئلہ بھی ایسا ہے کہ اوس کے متعلق ہوشیاری کے ساتھ تصفیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دیہی مدرسہ کی معلمہ کو جس کے فرائض نہایت اہم ہوتے ہیں اور جس میں جدت طرازی اور عمدہ کیرکٹر کی دو اہم خصوصیات ہوتی ہیں اپنے شہری ہمجولیوں سے کم تنخواہ ملنی چاہئیے؟

دوسرا حل یہ بتلایا گیا ہے کہ معلمات کو شہروں میں متعین کرنے سے قبل چار یا پانچ سال کے لیے دیہاتوں کو کارآموزانہ حیثیت سے بھیجا جائے اس کا نتیجہ اول تو یہ ہوگا کہ دیہی مدارس کی تعلیم نوجوان لڑکیوں کے ہاتھوں میں رہے گی اور دوسرا یہ کہ جب وہ چار یا پانچ سال کے بعد گاؤں سے شہر کو واپس ہوں گی تو مشق نہ ہونے کی وجہ سے اپنی طالب العلمانہ زندگی میں حاصل کیے ہوئے علم کو کھو چکی ہوں گی۔

ان حالات میں ہم اپنے راستہ کی تلاش میں ہیں اور ہمارا موجودہ نصاب شہر اور دیہات کی متحدہ ضروریات کی تکمیل کی غرض سے مرتب کیا گیا ہے۔ نصاب کا چوتھا سال پیشہ ورانہ تربیت کے لیے وقف کر دیا گیا ہے جس میں معلمی کی بہت کچھ مشق کرائی جاتی ہے۔ طریقہ تربیت کے اہم مسئلہ کے متعلق میں کانفرنس کا وقت نہیں لوں گی لیکن میری خواہش ہے کہ کسی مناسب موقع پر ان اراکین سے جو تربیتی کلیوں کے انتظام کے ذمہ دار ہیں اس بارہ میں بعض سوالات کروں۔

ٹریننگ کالج میں شریک ہونے کے بعد پہلے تین سال تک طالبات مابعد تحتانی اصول پر عام تعلیم پاتی ہیں۔ ذریعہ تعلیم عربی ہے اور اس زبان کی پیچیدگیوں کی تشریح کے لئے جس کی صرف و نحو اور لغت بعید وسیع ہے بہت سا وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ قدیم عربی زیادہ تر لوگوں کے لئے جو دیہی زبان استعمال کرتے ہیں ایک بند کتاب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ لوگوں کی موجودہ نہ کہ قدیم زبان کو نئے علوم کا ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے کسی زبردست مصلح کی ضرورت ہے۔

عام تاریخ اور جغرافیہ عالم نیز عربی بولنے والی قوم کی تاریخ اور جغرافیہ کے تفصیلی مطالعہ کو ہم بے حد اہمیت دیتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ان دو مضامین کی عمدہ تعلیم قومی اور مذہبی مخالفتوں کو دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے جو ہمارے چھوٹے سے ملک میں وقتاً فوقتاً پھوٹ پڑتے ہیں انگریزی بحیثیت زبان غیر پڑھائی جاتی ہے اور ہر لڑکی

ابھی چند ہفتے ہوئے ۹ سالہ بچوں میں سے ایک متعلمہ نے پوچھا تھا کہ کیا وہ اس مضمون کی تدریس
دے سکتی ہے۔ اس نے جواب دیا: ہاں اگر مجھے دیا جائے تو دے سکتی ہوں۔ مجھے
یاد ہے کہ اس زمانے میں صفائی پر ایک درس دیا جا رہا تھا جس کے سلسلہ میں ایک
مضمون لکھا گیا تھا۔ معلمہ نے بلی کی نقل اتار کر بتایا کہ وہ کس طرح اپنے آپ کو صاف رکھتی
ہے۔ بچوں سے کہا گیا کہ وہ معلمہ کی نقل اتاریں۔ چند لمحوں کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ سب چھوٹی
لڑکیاں اپنی آستینوں کو چاٹ رہی ہیں اور اپنے منہ پر [illegible] سبق کا اختتام
بھی پرلطف طریقہ پر ہوا۔ [illegible] لڑکیوں نے متحدہ طور پر دس مرتبہ بلند پکار کر پڑھ لیا
کہ بلیاں پرندوں کو کھا جاتی ہیں تو ایک پرندہ کو زمین پر چھوڑا گیا [illegible] ساتھ ہی ایک بچہ جو
الماری میں بند تھی پرندے کی طرف جھپٹی لیکن میں نے اس کو جلد سے پکڑ لیا۔ معلمہ مذکور
جماعت کے کام کو حقیقی زندگی کے مطابق بنانے کی انتہائی کوشش کرتی تھی۔ ہم اس سے
زیادہ اچھے کام کر سکتے ہیں کیونکہ ہمیں محکمہ صحت عامہ سے امداد مل سکتی ہے۔ گذشتہ
سال ہمارے ہاں کی لڑکیوں نے حفظان صحت اور بہبودی اطفال کے نصاب کے سلسلہ میں
مدرسہ کے ڈاکٹر کے ساتھ [illegible] علاج کا عملی تجربہ حاصل کیا۔ یہ وہ بیماریاں ہیں جن میں
مدرسہ کے (۶۰) فیصد بچے مبتلا ہوتے ہیں۔ اور میں شکریہ کے ساتھ لکھوں گی کہ روزانہ
علاج سے یہ فیصد (۹۲) سے جو سات سال پہلے تھا (۴۰) تک گھٹ گیا ہے۔ مواضع میں جہاں
نرسز نہیں ہوتیں یہ لڑکیاں ڈاکٹر کے نسخہ کے مطابق روزانہ علاج کرتی ہیں۔ علاج بہت
آسان ہے صرف چند قطرے ٹپکانے پڑتے ہیں اور چاندی کے نائٹریٹ سے چھونا پڑتا ہے
حادثات بہت کم وقوع میں آتے ہیں اگرچہ ہم نے حال ہی میں سنا ہے کہ ایک معلمہ نے
کونین کی خوراک بطور حفظ ما تقدم [illegible] کے مدرسہ کے کل بچوں کو سلور نائٹریٹ (Silver
Nitrate) اندرونی استعمال کے لئے دے دیا تھا لیکن خوش قسمتی سے صرف چند
گھنٹوں کی تکلیف رہی۔

بچوں کی کھلائی پلائی کا عملی کام بہبودیٔ اطفال کی ہتھہ کے زیر نگرانی کیا جاتا ہے ایسے ملک میں جہاں بچوں کی اموات زیادہ ہوتی ہیں معلماۃ کی تربیت کا یہ بھی ایک اہم جز ہے۔

میں نے چند روز قبل کہا تھا کہ ہمارے آخری امتحانات میں علم خانہ داری کا مضمون لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ہم اس مضمون کے عملی تجربات کو خاص وسعت دیتے ہیں۔ طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لئے کالج کے اقامت خانہ میں رہنا لازمی ہے میرا خیال ہے کہ ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ اچھی اخلاقی تربیت صرف اسی طریقہ سے ہوسکتی ہے مسٹر کیامنن بردم فیلڈ نے اس چیز کی اچھی طرح سے صراحت کردی ہے اس لئے میں کچھ اور کہنا ضروری نہیں سمجھتی۔ کالج میں قیام لازمی ہونے کی وجہ سے گھر کا سارا کام خود طالبات باری باری سے کرتی ہیں۔ اس طرح سے چھینیاں صاف کرنے کا کام اس سے زیادہ محنت والے کام سے بدل جاتا ہے۔ کہیں بستر پھیلانے کا کام ہوتا ہے اور کہیں برتن دھونے کا زیادہ تر وقت سینے پرونے اور دوسرے دستی کام کے لئے وقف کیا جاتا ہے کیونکہ ان معلماۃ کو ایسی لڑکیوں کو پڑھانا پڑتا ہے جو گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتی ہیں اور جنہیں کئی منٹوں کی فرصت رہتی ہے۔ صرف عیسائی لڑکیاں دوکانوں اور دفاتر میں کام کرنے کی غرض سے گھر کے باہر نکلتی ہیں۔ اور ان میں سے بھی صرف چند ہمارے بڑے شہری مدارس میں سوزن کاری کی ایک خاص جماعت کھولی گئی ہے جن میں تحتانی تعلیم سے فارغ شدہ لڑکیاں شریک ہوتی ہیں۔ ان سے اجرت تعلیم لی جاتی ہے۔ اکثر لڑکیاں اپنا لباس عروسی تیار کرنے کی غرض سے جماعت میں زیادہ مدت تک شریک رہتی ہیں۔ میں نہایت مسرت کے ساتھ آپ کو یہ معلوم کرانا چاہتی ہوں کہ اخلاقی ترغیب اور بعض اوقات مفتی سے درخواست کرکے ہمارے محکمہ نے بچپن کی شادیوں کو بھی بتدریج گھٹا دیا ہے۔ بچپن کی شادی سے میری مراد گیارہ یا بارہ سال کی عمر میں شادی ہے۔

ہم نے جسمانی تربیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے ہماری اکثر لڑکیاں گذشتہ جنگ کے افسوسناک مصائب کی وجہ سے ٹھٹری ہوئی اور غیر نشو نما یافتہ ہیں۔ ہم اون کی جسمانی حالت میں کھیل و ورزش اور گانے کے باقاعدہ نصاب کے ذریعہ ترقی دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا ایک طریقہ لڑکیوں کو ( ) بنانے کا ہے لیکن ... کا کام کالج کی چار دیواری ہی میں کرنا پڑتا ہے کیونکہ مسلمان والدین پردہ کے اصول کی خلاف ورزی یا ایسے کسی کام سے جو پردہ کے خلاف سمجھا جائے رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

ادبی و فنی تعلیم کا انضمام

مسٹر ماتھن نے فنی تعلیم کے بابت جو خیالات امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس میں ظاہر فرمائے وہ نہایت قابل قدر ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس وقت جبکہ فنی تعلیم کی طرف سرکار و رعایا کا خاصہ رجحان ہے مندرجہ ذیل مضمون غور سے دیکھا جائے گا۔

مدیر

مسٹر ماتھن نے نفس مضمون پر تقریر کرنے سے پہلے امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ دیسی ریاستوں کے نمایندوں کی جانب سے اس امتنان و تشکر کے اظہار کی اجازت چاہتے ہیں جو اس کانفرنس کی پہلی دعوت پر انہوں نے محسوس کیا ہے اور یہ کہنا چاہتے ہیں کہ رقبہ آبادی اور وسعت کے نظر کرتے دیسی ریاستوں کو سلطنت برطانیہ میں ایک اہمیت حاصل ہے اور اگرچہ کہ سماجی۔ اقتصادی اور تعلیمی مسائل ان کے ہاں بھی بعینہ علاقہ انگریزی کے سے ہیں تاہم ان کی مخصوص اور انفرادی اغراض و مشکلات اور بہت ممکن ہے کہ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کی بنا پر جو انہیں تعلیمی تحریکات میں حاصل ہوئے ہیں وہ اس کانفرنس کے لئے کچھ نہ کچھ قیمتی معلومات فراہم کر سکیں۔

مقرر صاحب نے کہا کہ ان کے تفویض کردہ بحث پر گفتگو شروع کرتے ہوئے وہ یہ کہدینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کے خیالات (آراء) ایسے تجربات کی بنا پر ہیں جو ریاست میسور (جس کے کہ وہ نمائندے ہیں) اور ہندوستان کے زیر مشاہدہ حصوں کی موجودہ حالات سے مختص ہوں۔ انہوں نے بیان کیا کہ اس وقت یہ خیال میسور میں عام طور پر پھیل گیا ہے کہ وہ طرز تعلیم جو آج کل کے تحتانی اور وسطانی مدارس میں رائج ہے اور جس میں صرف ادبیات کی تعلیم و تدریس پر انحصار کیا گیا ہے ملک کے لئے مفید نہیں رہی۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ نوجوانان ملک کی ایک بہت بڑی جماعت میں زرعی اور ایسے صنعتی و زرعی مشاغل سے جو سماجی اقتصادیات کے روح رواں ہیں نہ صرف بے پروائی بلکہ ایک تنفر سا پیدا ہوگیا ہے ملک میں ہر طرف اس کی پکار ہے کہ پیشہ وری، فنی اور صنعتی تعلیم کا انتظام اخلاقی و ادبی تعلیم کے عوض یا اس کے ساتھ ساتھ کیا جائے۔ اس وقت میسور میں یا ہندوستان نے اور حصول میں تعلیمی دنیا کے ارباب حل و عقد کے آگے تحتانی اور وسطانی مدارس میں علمی و فنی اغراض کا تصادم ایک اہم اور غور طلب مسئلہ ہوگیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم و تربیت کا لحاظ کرتے علمی اور فنی اغراض میں زمانہ قدیم سے روایتاً ایک ضد چلی آرہی ہے۔ تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ عملی قابلیت اور استعداد کے لئے فنی تعلیم دنیا میں پہلے وجود میں آئی اور فلسفۂ تعلیم کے ارتقائی مدارج میں علوم و ادبیات کے ذریعہ شخصی اور ذاتی تربیت کا خیال اس کے بعد کا ہے۔ مگر مغرب میں سوسائٹی کی درجہ بندی نے اور ہندوستان میں ذات پات نے کہ جس میں اونچی اور نیچی قوموں کے درمیان اہم امتیاز رکھے گئے ہیں علمی و فنی اغراض کی باہمی ضد کو اور بھی قوی کر دیا۔ اونچی ذات والوں سے ہندوستان میں اور دولت مندوں سے یورپ میں یہ توقع کی گئی تھی کہ انہیں شخصی تعلیم و تربیت کے لئے زیادہ وقت اور موقع حاصل ہے، ورعرب یا نیچ قوم کے افراد سے صرف ضروریات زندگی کی فراہمی کی امید تھی۔ مگر سوسائٹی کی جمہوری تنظیم میں جو سلطنت برطانیہ کے ہر حصے کے لئے از حد مفید ثابت ہوئی ہے اس طرح سے علم و فن کے اغراض کا التقا ملا دم

نہ ہونا چاہیئے اور ہر ایک کو اس کا موقع ملنا چاہیئے کہ اپنی نمایاں اور مخصوص قابلیتوں کو ترقی
دے سکے اور اپنی شخصی اور انفرادی زندگی کو مدارج کمال تک پہونچا سکے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اس
کمال کا معاوضہ ملک اپنے لئے فنی خدمات اور فن کی تعلیم کے شکل میں طلب کرے۔ حقیقی فلسفہ
تعلیم میں علمی اور فنی اغراض ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ممد و معاون واقع ہوئے ہیں۔ مثل
اور ممالک کے ہندوستان میں بھی حکومت نے پہلے علمی اغراض کی ضرورت کو تسلیم کیا اور
ان کی تکمیل کرنی شروع کی۔ فنی ضروریات خانگی طور پر پورے ہوتے یا ان میں قدیم طریقہ استاد
وشاگردی کا رائج رہا۔ مگر جب اقتصادی حالات کے تغیر کے سبب ان قدیم تاریخی طریقوں سے
موجودہ فنی ضروریات پورے نہ ہو سکے تو ملک نے محسوس کیا کہ باقاعدہ اور منظم فنی تعلیم ایک
سماجی ضرورت ہے۔ اس کے لئے بھی حکومت کی اعانت اور اس پر حکومت کا اختیار ویسا ہی
لازمی ہے جیسے اور تمام تعلیمی اور تربیتی تنظیموں پر۔ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی ملک کے مختلف
حصوں میں فنی اور صنعتی مدارس کھولے جانے لگے۔ مگر موجودہ ارادوں سے کہیں زیادہ عملی ضرورت
اس وقت محسوس کی جا رہی ہے۔

جہاں جہاں کہ درجہ بندی اور فرقہ بندی اور ذاتوں کا امتیاز موجود ہے وہاں
فنی مدارس علمی مدارس کے دوش بدوش قائم کر دیئے جانا بہت کافی سمجھا گیا ہے۔ مگر ایک
جمہوری سوسائٹی میں مسئلہ تعلیم کو اس طرح سے حل کرنے کی کوشش کرنا مفید نہیں۔ تحصیل علم کے
مواقع سب کو مساوی طور پر حاصل ہونا چاہیئے۔ مساوی مواقع حاصل ہونے سے یہ مطلب
نہیں کہ وہ سب کو یکساں میسر ہوں۔ عام مدارس میں جو ایک ادبی اور تعمیلی تعلیم کا سلسلہ جاری
ہے وہ مدارس ابتدائی کی ہر ایک شرکت کرنے والے کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔
تحتانیہ اور فوقانیہ مدارس اس وقت ایسے مقام سمجھے گئے ہیں کہ جہاں ہر ایک طالب علم کو
یونیورسٹی کے اعلیٰ تعلیمی درس گاہوں تک پہونچنے کے لئے تیار کیا جائے۔ یہ نکتہ نظر بدلنا چاہیئے
ان مدارس میں بہت بڑا حصہ طالب علموں کا ایسا ہوتا ہے کہ جن میں ادبی تعلیم کے اونچے درجوں

تک پہونچنے کی نہ صلاحیت ہے نہ خواہش اور سلسلہ تعلیم کے مختلف منازل پر مزید تحصیل علم کی قابلیت نہ رکھنے سے مدارس سے علیحدہ ہوتے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض فنی اور صنعتی مدارس کی شرکت اختیار کر لیتے ہیں مگر اپنے کو حقیر تحصیل علم میں ناکامیاب اور پست درجہ کا انسان سمجھتے ہوئے ایسے طالب علموں کا جو ادبی تعلیم کے بلند منزلوں تک پہونچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے مدارس کے مختلف جماعتوں سے اس کثرت کے ساتھ نکلنا نوع انسان کو رائگاں کر رہا ہے اور ملک کے لئے ایک بڑا اسماجی نقصان ہے اس تضیع اوقات سے بچنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ عام مدارس میں ادبی تعلیم کے مبادیات کے ساتھ ساتھ مختلف قابلیت اور صلاحیت رکھتے ہوئے طالب علموں کو اس کا ساوی موقع دیا جائے جس چیز میں وہ کمال پیدا کر سکتے ہیں اس کی طرف اپنے وقت کے بہت بڑے حصے کو صرف کر سکیں۔ عام تعلیمی مدارس کا فرض ہے کہ وہ انفرادی طور پر ہر طالب علم کے رجحان طبیعت کو معلوم کریں اور اسے نہ صرف زندگی میں اپنا راستہ اختیار کرنے میں مدد دیں بلکہ اس راستے میں آئندہ کامیاب ہونے کے قابل بنا دیں۔ اس اصول کے تسلیم کر لینے اور اس پر کاربند ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عام مدرسوں میں نصاب تعلیم کو بہت وسیع اور بعض ایسے مضامین کو ضرورتاً داخل کر دیا جائے جو ضروریات زندگی سے متعلق ہوں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ انگلستان اور بعض دوسرے ملکوں نے اس اصول کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے اور طریقہ تعلیم کو اس سانچے پر ڈھال رہے ہیں۔

عام مدارس میں فنی تعلیم کا انتظام کرنا نہ صرف اس لئے ضروری ہے کہ مختلف قابلیت اور صلاحیت رکھنے والے طالب علموں کو مساوی مواقع دئے جائیں بلکہ صنعتی اور فنی تربیت کے ہر ایک تجویز اور طریقہ میں اس طرح کی ابتدائی تعلیم کی شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان کے مڈل کلاس جماعتوں میں دست کاری سے ایک گونہ بے پروائی پائی جاتی ہے۔ اور عموماً اس کلاس کے لڑکوں میں نہ دست کاری کی صلاحیت ہے نہ ایجاد کا مادہ علاوہ بریں اس جماعت کے بعض جز ایسے ہیں کہ ان میں تاجرانہ ذکاوت ہے اور نہ کاروبار میں دلچسپی لینے کی عادت۔ سوال یہ

پیدا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کی ان جماعتوں میں کاریگری سے رغبت صنعت و حرفت سے دل چسپی اور کاروبار کی قابلیت کس طرح پیدا کی جائے۔ اس قسم کی صلاحیت پیدا کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ صرف فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم کے مدارس کھول دیئے جائیں بلکہ عام مدارس کے ابتدائی تعلیم و تربیت میں ان کا خاص لحاظ رکھا جائے کہ لڑکوں کو "آنکھ اور ہاتھ کی استعمال" کی تعلیم دی جا سکے۔ اور ان میں اپنی ذات پر بھروسہ کرنے اور مشکلوں کے حل کرنے کی قابلیت پیدا کی جائے۔ اگر فنی مدارس کو حقیقتاً مفید بنانا ہے تو عام مدارس کے نصاب میں اس طرح کی اصلاح چاہیئے کہ نہ صرف لڑکوں کو عقل استعمال کرنے اور ہاتھ سے کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے والی تربیت کو بھی اس نصاب میں ایک مقام دیا جائے بلکہ ادبیات کے ساتھ ساتھ معقولات کی بھی تعلیم ہو۔ ان مدارس کی آخری جماعتوں میں چند خود اختیاری فنی کورس ایسے رکھے جائیں کہ جن میں پیشہ وارانہ مشاغل سے دل چسپی اور میلان پیدا کرنے کا بلکہ پیشوں کو اختیار کرنے میں سہولت پیدا کرنے والی تعلیم کا طلبہ کی اس بہت بڑی جماعت کے لئے انتظام کیا جائے جو یونیورسٹی تک پہونچنے کی نہ اپنے میں صلاحیت رکھتے ہیں نہ دارالعلوم کے مصارف برداشت کرنے کی استعداد اور اس لئے مجبور ہیں کہ فنوں اور پیشوں کے تعلیم دینے والے مدارس میں داخل ہوں یا صنعتی مشاغل اور تاجرانہ کاروبار میں منہمک ہو جائیں۔

اس امر پر خصوصیت سے زور دیا جانا چاہیئے کہ صنعتی یا فنی مدارس کے اغراض و مقاصد اور طرز تعلیم میں اور عام مدارس کے فنی تعلیم کے طریقوں میں نمایاں اور اصولی فرق ہو۔ عام مدرسوں میں فنی تعلیم بالراست مخصوص فنون سے متعلق نہ ہو بلکہ ایسی عام ہو کہ طلبہ کو آگے چل کر مختلف فنوں اور پیشوں سے متعلقہ تعلیم حاصل کرنے میں سہولت ہو سکے اور ان میں انسانی پیشوں کی قدر افزا بصیرت۔ ان سے ہمدردانہ مواصلت اور فنی ذکاوت پیدا ہونی چاہیئے۔ علاوہ بریں یہ نصاب عام تعلیمی اغراض کے ماتحت ہوا کرے

اس کے برعکس فنی یا صنعتی مدارس میں اس کی کوشش کی جائے کہ لڑکوں میں مخصوص فنون کی مہارت اور کام کرنے کی قابلیت پیدا ہو۔ اول الذکر نصاب عام تعلیم میں فنی رجحان پیدا کر دیتا ہے۔ طلبہ کو اس کا موقع دیتا ہے کہ مختلف آزمائشیں کریں تاکہ انہیں اپنی فطری قابلیت اور میلان طبیعت کا اندازہ ہو۔ علاوہ اس کے اگر وہ آئندہ کسی مخصوص فن کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو موجودہ نصاب اس کے لئے منزل اول ہو جائے اس کے مقابل میں فنی مدارس کی تعلیم محدود نفع کے اصول کو پیش نظر رکھنے والی ایک خاص پیشہ یا فن کے لئے تیار کرنے والی اور بار آور کاروبار کے اقتصادی کیفیات کا نمونہ ہوتی ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ عام مدارس کی فنی تعلیم نہ صرف عام اور عوام کو فائدہ پہونچانے والے نصاب سے مطابقت کرتی ہے بلکہ اس نصاب کا ایک حقیقی اور قیمتی جز ہو ساتھ ہی ساتھ فنی اور پیشہ وارانہ مدارس میں عام تعلیمی مضامین کو ایک چھوٹی سی ہی جگہ دے کر یہاں کے نصاب کو محدود و تنگ اور نفع خاص سے مختص نہ رہنے دیا جائے۔

عام مدارس اور فنی مدارس کا باہمی تعلق اس طرح قایم کرنا چاہئیے کہ تعلیمی اور فنی اغراض ہم آہنگ ہوتے جائیں۔ تعلیم عام کے تین درجوں (تحتانیہ۔ وسطانیہ اور فوقانیہ) کی مطابقت کرتے ہوئے فنی تعلیم کے بھی تین درجے قرار دئے جائیں۔ اس نصاب کا ابتدائی یا تحتانیہ درجہ اس غرض سے ہو کہ وہاں مزارعین۔ اہل حرفہ۔ دست کار اور فیاکٹری میں کام کرنے والوں کو تعلیم دی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ نصاب تعلیم عام کے تحتانیہ درجہ کی کہ جہاں پڑھنا لکھنا اور ابتدائی ریاضیات سکھائے جاتے ہوں مطابقت کرتا ہوگا۔ اس کے علاوہ یہاں آنکھ اور ہاتھ کے استعمال کرنے کی اور ذکاوت۔ قوت امتیاز اور قوت تحریک کے کام میں لانے کی تعلیم دی جائے گی۔ ہندوستان میں جہاں کہ دیہی آبادی زیادہ ہے اس ابتدائی درجہ کا طریق تعلیم مقامی خصوصیات اور حالات سے خاص مناسبت رکھتا ہوا ہو کہ طلبہ اس میں ایک گونہ واقفیت کارانہ اور معقول دلچسپی

ے سکیں۔ وہیں علاقوں میں جس ابتدائی تعلیم کا معمولاً بافہانی ہوا کرے، ان مدارس تحتانیہ کے آخری تین درجوں میں (جو ہندوستان میں مڈل اسکول کہلاتے ہیں) جہاں طلبہ کی عمر عموماً تیرہ یا چودہ برس کی ہوا کرتی ہے نصاب میں فنی دروس اس طرح داخل کئے جائیں کہ لڑکوں میں فنون اور پیشوں کی طرف میلان پیدا ہو جائے۔ مقرر نے بیان کیا کہ میسور میں آج کل یہی ہو رہا ہے۔ متعدد مدارس میں ایسے فنی مضامین نصاب میں داخل کئے گئے ہیں جیسے زراعت، کیڑوں سے ریشم نکالنا، نجاری، بید کا کام، دھات کا کام، چمڑے کا کام، پارچہ بافی، آہنگری لڑکوں کے لئے اور خیاطی اور نور دوزی کا کام لڑکیوں کے لئے۔ فنی تعلیم کے ثانوی درجہ میں طلبہ کو ایسی صنعتوں (دستی مشینوں وغیرہ) کی تعلیم دی جائے جس میں مستعملہ سائنٹفک قوتوں اور ذریعوں کو سمجھنے اور استعمال کرنے کی قابلیت طلبہ میں پیدا ہو سکے۔ فنی تعلیم کے اس دوسرے درجہ کے شروع ہونے کے پہلے عام تعلیم کا ثانویہ مدارس میں نصاب ایسا ہونا چاہئے کہ تعلیم حقیقی یعنی عملی سائنس کو اس طرح سکھلایا جائے کہ طبعی اور فطری علوم میں اور ریاضیات و ہندسہ کے مبادیات میں طلبہ کو اچھا وقوف حاصل ہو۔ اس درجہ کے آخری دو سال میں مختلف فنی مضامین میں سے اپنے لئے کسی ایک کو اختیار کر لینے کا طلبہ کو موقع دیا جائے اور اس اختیار کردہ فن کے لئے تعلیم کا انتظام رہے۔ یہاں پیشوں اور فنون کا مرتبہ مدارس ابتدائی کے آخری کلاسوں کے برعکس صرف دست کاری کے درجوں تک محدود نہ ہونا چاہئے بلکہ طریقۂ تعلیم ایسا وسیع اور سودمند ہو اور اس میں سائنس کا جز اس قدر شامل رہے کہ لڑکوں کو اپنی عقل و ذکاوت کے استعمال کرنے کا اور اپنے سائنٹفک معلومات کے ہوشیاری کے ساتھ کام میں لانے کا موقع ملا کرے۔ اس ضمن میں میسور کے مدارس فوقانیہ میں حسب ذیل فنون و پیشوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ الکٹرک وائرنگ (برقی کا مکانوں میں چراغوں میں پنکھوں میں جھولوں میں یا اسی قسم کے دوسرے موقعوں پر

جانا) جاموٹری فیٹرس کا کام (سنجاری کا ایک اعلیٰ درجہ) خطاطی اور چھاپہ خانہ کا کام سروے (پیمائش) اور نقشہ کشی کا کام، پارچہ بافی، شارٹ ہینڈ، ٹائپ رائٹنگ، کاروباری خط و کتابت اور کاروباری حسابات اور کتابات کا رکھنا۔ تجویز یہ ہوئی ہے کہ جیسے جیسے سہولت اجازت دیتا جائے ویسے ویسے دوسرے مضامین بھی نصاب میں داخل ہوتے جائیں مثلاً زراعت، دواسازی اور دوافروشی تلغرافات کا کام موٹر درست کرنے اور صاف کرنے کا کام۔

غرض یہ ہے کہ بقول کارلائل ہر موقع پر تربیت کا انتظام ہو سکے۔ ثانویہ مدارس کی اونچی جماعتوں میں اور مدارس فوقانیہ میں طلبہ کو اس کا موقع دیا جائے کہ عملی تحریکات کے مختلف شعبوں میں آزمائش کر کے دیکھ لیں اور ایسی تحریکات اور فنون میں انتخاب کا موقع حاصل رہے اور وہ بھی اس طرح سے کہ ہر بعد کا انتخاب پہلے انتخاب سے مقابلتاً محدود دائرہ میں ہو تاکہ بتدریج انتخاب کرنے والا کسی ایک خاص فن یا پیشے تک پہونچنے کے قابل ہو سکے سب سے اول ابتدائی تفریق ان لوگوں میں ہو جو بالکل عام تعلیمی نصاب اختیار کرنا چاہتے ہیں اور وہ لوگ جو فنی یا عملی تعلیم کی طرف راغب ہیں مدارس ثانویہ طلبہ کو ایسے راستے پر لے چلیں کہ جہاں انھیں اپنے لئے کسی خاص تجارت فن یا پیشے کے انتخاب کرنے کا موقع ملے اور جس کی تحصیل کے لئے وہ فنی مدارس میں باقاعدہ شرکت کر سکیں۔

مقرر صاحب نے بیان کیا کہ وہ فنی تعلیم کے ان اعلیٰ درجوں پر بحث نہیں کرنا چاہتے جو تعلیم عام کے مدارج جامعہ سے مساوی ہوں کیونکہ یہ مضمون ان کے بحث سے خارج تھا بلکہ انہوں نے اپنی تجاویز کو اجمالاً پانچ سرخیوں میں ظاہر کیا جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) فنی تعلیم اور تعلیم عام کے اغراض و مقاصد ایک دوسرے کی ضد ہیں

واضح نہ ہوں بلکہ ایک دوسرے کے لئے تکمیل اور اتمامی ہوں

(۲) مدارس عام کے جملہ کلاسوں میں جو تعلیم دی جائے وہ ایسی نہ ہو کہ طلبہ کو صرف یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے تیار کر سکے بلکہ ان لوگوں کے لئے جو ادبیات سے دلچسپی نہ رکھتے ہوں اور فنون اور پیشوں کی تحصیل کا خیال رکھتے ہوں مفید ثابت ہو۔

(۳) عام مدارس کے نصاب کو اس طرح بدلا جائے کہ ان میں فنی مضامین کی تعلیم ضروریات زندگی کے عملی حالات کو مدنظر رکھ کر دی جائے۔

(۴) عام مدارس کا فنی نصاب اس طرح تجویز کیا جائے کہ طلبہ میں فنون کی طرف میلان پیدا ہو نہ اس طرح سے کہ ان میں خاص فنون کی مہارت پیدا کر دی جائے کیوں کہ یہ کام فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم کے مدارس سے متعلق ہونا چاہیئے

(۵) فنی تعلیم و تربیت کا نصاب درجہ بدرجہ تعلیم عام کے نصاب سے مطابقت کرتا رہے۔

حافظہ اور معنی

اگر ہم نظم کے ایک مصرع کو یاد رکھنا چاہیں تو اس کے لئے کم وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اتنے ہی الفاظ کی تعداد کو نثر سے لے کر حفظ کریں تو نسبتاً بہت زیادہ وقت درکار ہوگا ۔ اس بات کی وجہ کہ نظم یاد کرنے میں کم وقت صرف ہوتا ہے یہ ہے کہ اس میں الفاظ ل کر معنی پیدا کرتے ہیں اور دوسری صورت میں یہ بات نہیں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم ایک عام قاعدہ کو معلوم کر چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ معنی کے تعلق کی وجہ سے حافظہ کو مدد ملتی ہے اور یاد رکھنا آسان ہو جاتا ہے۔

لہٰذا ہم کو ہر اس چیز کے معنی معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جس کو ہم یاد رکھنا چاہیں اور اگر کسی چیز کے کوئی معنی ہی نہ ہوں تو پھر کیا ضرورت ہے کہ بلاوجہ ہم اپنے دماغ کو اس سے بوجھل بنائیں ؟ یہ سچ ہے کہ بعض لوگوں کا حافظہ الفاظ اور فقرات کے لئے اچھا ہوتا ہے۔ لیکن یہی بات طوطوں اور کمسن بچوں میں بھی ہوتی ہے غلط فہمی سے اس بات کو ذہن کی چالاکی یا ہوشیاری تصور کر لیا جاتا ہے ۔ لیکن یہ غلط ہے۔ بعض اشخاص ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو حافظ کی قوت پر فخر کرتے ہیں لیکن مقصد و منشاء اور کمال کے نظر کرتے اس قوت کا اس حافظہ سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا جو ہر اس چیز کے معنی سمجھنے پر مبنی ہوتا ہے جس کا یاد رکھنا ضروری ہو۔ ہم کو چاہیئے کہ کوشش سے اس قسم کی فہم حاصل کریں ۔

ہمارا جو کچھ مطلب ہے اس کی ایک مختصر مثال ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ ہم اندازاً بارہ اعداد کی ایک قطار تیار کرتے ہیں :-

۶۶۱۴۱۲۹۱۵۴۰۱

بغیر کسی زیادہ تکلیف کے ہم ان اعداد کو یاد رکھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ان اعداد کو معنی کے لباس سے آراستہ کر دیں گے تو ان کا یاد رکھنا بدرجہا آسان ہو جائیگا ذیل میں یہی بارہ اعداد درج ہیں۔

۱۴۹۲ / ۱۲۱۵ / ۱۰۶۶

اب بتلاؤ کہ دونوں میں کونسا طریقہ یاد رکھنے کے لئے آسان تر ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسرا طریقہ۔ اس لئے کہ ہم نے ان اعداد کو تین مسلسل سنین میں منقسم کر دیے ہیں۔ جن کو شاید ہم مدرسہ میں پڑھ چکے ہیں۔

کاروبار میں ہر چیز کے کچھ نہ کچھ معنی ہوتے ہیں اور ہمارا کام یہ ہے کہ ان معنوں کو معلوم کریں۔ موجودہ دنیا میں بے کار یا بے معنی اشیاء کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اعداد قیمت، مقدار، صفت، ترتیب وغیرہ کسی چیز کو ظاہر نہیں کر سکتے؟ کسی حالت میں بھی جب ان کو یاد رکھنا ہو تو تم کو چاہیئے کہ ان سے کچھ نہ کچھ معنی متعلق کر دو تم اس بات کو بھول سکتے ہو کہ کوئی عدد ۳۴ ہے یا ۴۳ اور متعجب ہو سکتے ہو کہ کونسا عدد پہلے تھا۔ لیکن یہ اعداد ان روپیوں کو ظاہر کریں جو تم کو اپنی آئندہ تنخواہ سے ادا کرنا ہے تو تم ان دونوں اعداد کو کبھی مخلوط نہ کر سکو گے اس حالت میں ان کو مخلوط کرنا یا بھول جانا ناممکن ہوگا۔ یہی خیال تم اپنے کاروبار سے بھی متعلق کر دو۔ اور ذہنی مردہ مواد سے بالکل سروکار مت رکھو بلکہ اس کو حقیقت سے مربوط کر کے زندہ اور قوی کر لو تو پھر حافظہ ہر موقع پر تیار رہے گا۔ ہم بار بار یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ حافظہ میں ناکام ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ صرف آواز نہ کہ مطلب کو یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم کو چاہیئے کہ اس پرانے ضرب المثل کے مطابق عمل کریں:-

(Take care of the annas and the Sounds will take care of themselves) مطلب کی احتیاط کرو اور آواز خود اپنی آپ احتیاط کرلے گی۔

اب ایک لمحہ کے لئے اگر ہم اپنی امداد والی مثال پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کو بطور تواریخ تسلیم کرنے کے علاوہ ہم کچھ اور بھی کئے ہیں یعنی یہ کہ منفرد اعداد کو چار چار کے مجموعوں میں ترتیب دینے سے ہم اپنے خیال کی وحدت یا (اکائی) کو وسیع کئے ہیں۔ یہ ایک نہایت ہی اہم اُصول ہے ہم کسی جانب بھی اس وقت تک زیادہ ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ ہم بڑے بڑے مجموعہ ہائے خیال (اکائیاں) تیار کرنا شروع نہ کر دیں۔ جب ہم چار چار عدد کو سمجھ جاتے ہیں تو ایک ایک عدد کو سمجھنے سے بہت زیادہ ہم ترقی کر سکتے ہیں۔

بچہ اپنے پیسوں میں پہلے دھیلے اور رفتہ رفتہ ایک پیسہ کا تصور کرتا ہے۔ مدرسہ کی عمر کو پہنچنے تک وہ غالباً چند پیسوں کا تصور کر سکتا ہے۔ اس کی ماں ان روپیوں کا خیال کرتی ہے جن کو وہ اس ہفتہ مکان پر خرچ کرنے والی ہوتی ہے اور باپ غالباً کئی سو روپیوں کو ایک اکائی کے طور پر تصور کرتا ہے۔ اور اگر وہ کوئی محاسب ہو تو غالباً وہ سروں کے روپیوں کی نسبت ہزار کو ایک اکائی تصور کر سکتا ہے۔ باپ اگر صرف دھیلے ہی کا تصور کرتا رہے تو اس کو کام کرنا بے حد مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ قومی فضول خرچی بھی اسی سلسلہ کے مشابہ ہے جو حد سے زیادہ عمل میں لایا گیا ہے۔ اُس وقت ہم کئی لاکھ کا تصور ایک اکائی کے طور پر کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم اس قدر رقم تک اپنا ہاتھ بھی نہیں لے جا سکتے۔

معمار بھی ایک معمولی خشت ساز ہے۔ اس لئے کہ وہ اینٹوں پر ہی غور کرتا رہتا ہے اور جب تک وہ ان چھوٹی اکائیوں کا خیال کرتا رہے گا نہایت ہی غربت کی حالت میں رہے گا۔ جوں ہی وہ اپنی اکائی یا وحدت خیال کو صد ہا یا اس سے زیادہ تک

وسیع کردے گا تو بہت جلد وہ ایک سربر آوردہ معمار بن جائے گا۔ اور جب وہ پورے ٹھیکہ کا ایک اکائی کے طور پر تصور کرے گا تو غالباً معماروں کا سردار ہو جائے گا یا خود اپنے میر عمارت کی حیثیت اختیار کرلے گا اس لئے کہ اس کی اکائی اس وقت اتنی بڑی ہو گی کہ اینٹ کے مختلف اقسام اس میں شامل رہیں گے۔ بالکل اسی قسم کی ترقی الفاظ سے لے کر ادب تک ہے پہلے ہم حروف تہجی میں پھنسے رہتے ہیں۔ اس کے بعد یک حرفی دو حرفی، سہ حرفی، چہار حرفی و پنج حرفی الفاظ کے ساتھ درجہ بدرجہ پھنسے رہتے ہیں حتیٰ کہ ایک ہی نظر میں ہم تمام الفاظ پڑھنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور حروف کے متعلق کچھ خیال ہی نہیں کرتے۔ اس کے بعد ہم جملوں اور فقروں کو لیتے ہیں کہا جاتا ہے کہ ایک رسالہ کے مدیر کا حس اس بارہ میں اس قدر ترقی یافتہ ہوتا ہے کہ پورا مضمون اس کے واسطے ایک اکائی کا کام دیتا ہے۔ اور ایک ہی نظر میں پورے مضمون کو سمجھ لیتا ہے۔ غالباً یہ صحیح ہے اور ممکن ہے کہ غلط ہو۔ لیکن ہر حالت میں معلومات میں ترقی کا ذریعہ بھی بڑی بڑی اکائیوں کو ترتیب دینے کا ہے اور صرف معلومات ذہنی ہی حافظہ کی ترقی کا باعث ہیں۔

میں نے ایک پست قد لڑکے سے ایک کارخانہ میں ایک دن گفتگو کیا۔ جہاں کے کاروبار ابھی ابھی ایک محدود کمپنی میں منتقل ہو چکے تھے میں نے اس سے دریافت کیا کہ "کیا وہ ڈائرکٹر ہونا چاہتا ہے؟ اس نے کہا "نہیں،، میں نے اس کا سبب پوچھا۔ جواب دیا کہ جب وہ بڑا ہو جائے تو خود اپنا ذاتی کارخانہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ اب یہاں مقام غور ہے کہ اس کا جذبہ کس قدر صحیح اصول پر مبنی ہے۔ تیل کی قندیلوں سے صفائی اشیاء کا کام اور اس سے صرف اشیاء کا کام اور اس سے آگے اپنا ذاتی کارخانہ قائم کرنے کا خیال۔ ہر قدم پر اکائی حسب طریقہ بالا وسیع اور وسیع تر ہوتی گئی ہے۔ اور تخیل ہمت اور جرأت دلاتا گیا ہے یہ لڑکا ضرور ترقی کرے گا اس لئے کہ وہ صحیح راستہ

پر گامزن ہے۔

جب ہم کسی قدر طویل چیز کو یاد رکھنا چاہیں۔ چاہے وہ کوئی نظم ہو۔ یا غزل یا ڈرامہ کا کوئی حصہ تو ہم کو چاہیئے کہ اس کو شروع سے آخر تک پوری طور پر پڑھ لیں تاکہ اس کا عام مطلب سمجھ میں آجائے۔ جب یہ صاف ہو جائے تو فرداً فرداً اشعار یا حصص کو یاد کریں اور قدرۃً وہ اس طریقہ سے یاد رہ جائیں گے لیکن اگر ہم عوام کے مانند عمل کریں اور اس کا ایک ایک شعر یا ایک ایک حصہ یاد کریں تو جب تک ہم آخری حصہ تک نہیں پہنچیں گے معنی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ اس طریق عمل سے غیر ضروری اور بے کار محنت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اور دوسرے طریق عمل سے وقت کم صرف ہوتا ہے اور نتیجہ بہتر ظاہر ہوتا ہے۔

الفاظ کے معنی اور اکائی کو وسعت دینے کے متعلق متذکرہ بالا خیالات اکثر حالات میں کارآمد ہیں مثلاً موسیقی میں تناسب کے معنوں کا علم ہی ایک بڑی مدد ہے۔ اور موسیقی کا حافظ حقیقی معنوں میں بغیر اس کے ناممکن ہے صنعت وحرفت میں یہ بات بے کار ہوگی کہ ہم کسی ایسی مشین کو دیکھ کر یاد رکھنے کی کوشش کریں جس کے لاتعداد پرزوں اور حصوں کے معنی سے ہم ناواقف ہوں۔ لیکن جیسے ہی ہم ان حصوں کے معنی کو سمجھ لیں گے تو مشین کے متعلق ہمارا حافظہ قوی ہو جائے گا۔ الفاظ کے ہجوں کے متعلق بھی اس کے معنی کی وجہ سے جو ماخذ لفظ کے لحاظ سے ہوں۔ ہم بہت سی غلطیوں سے باز رہیں گے بہر حال معنی جاننے کے اور بھی بہت سے فوائد ہیں جن کے اظہار کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔

تعلیم بذریعۂ قصہ گوئی

(۲)

قصہ گوئی گانے کے میلان کو ابھارتی ہے

مدارس نہ صرف عوام کے لڑکے لڑکیوں کو تربیت ہی دیتے ہیں جس سے وہ دنیا میں کھانے کمانے کے قابل ہو جاویں بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ ان کے لئے ایسے ذرائع مہیا کریں جن سے وہ اپنے دلوں کو خوش بھی رکھ سکیں اور ان میں وسیع اور گہرے جذبات پیدا ہو جاویں۔ اس کی روحیں قوی ہو کر اس قابل ہو جاویں کہ ان میں حقیقت اور خوبصورتی کا احساس ترقی کر جائے اور اپنے ابنائے جنس کے غم و شادی میں ان کی ہمدردی بڑھ جائے۔ اس لئے بعض مدارس میں مصوری و موسیقی بھی داخل درس ہے جو فنون کی بڑی شاخیں ہیں لیکن اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم بچوں کو ایک پیشہ ور گویا یا مصور بنانا چاہتے ہیں۔ بلکہ معمولی طور پر ان میں عام انسان بننے کی صلاحیت پیدا کرا دیتے ہیں کہ وہ رنگ و خوبصورتی کو سراہ سکیں اور اس طرح اپنا دماغ وسیع اور دل کو خوش کر سکیں۔

نوجوان جو سنتے ہیں اس سے ان کا مذاق ترقی کرتا ہے۔ جب بچے کو بہتر لوگوں کی صحبت ملے گی اس کی زندگی بھی بہتر ہو گی اور وہ خود بھی دوسروں کو خوش کر سکے گا علاوہ اس کے بچوں کو گانے اور ایکٹ کرنے کی تعلیم دینا چاہیئے اور ان کو اس کے مواقع دینے چاہئیں کہ وہ اچھا گانا سن سکیں اور موسیقی کے گھنٹہ کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لئے اس کے مصنف کے قصہ کو بھی بیان کرنا چاہیئے۔ اس طرح وہ موسیقی کے اعلیٰ مذاق کے دل دادہ ہو جاویں گے۔ ایک اٹلی کے شاعر کا قول ہے کہ جو شخص دنیا کو ایک اعلیٰ خیال یا نیا راگ دیتا ہے وہ گول کنڈہ کے ہیرے سے بھی زیادہ قیمت ہے۔ اس لئے جو شخص بچے کو ایک اعلیٰ خیال یا موسیقی کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے وہ کچھ اس سے کم

قیمتی کام انجام نہیں دیتا جو اس کے مصنف نے کیا ہے۔ وہ بھی مثل اس معمار کے ہے جو ایک بنیاد پر مضبوط عمارت کو تعمیر کرتا ہے اس لئے اس قسم کی محنت بھی بلا معاوضہ پائے ہوئے نہیں رہتی۔

قصہ گوئی فنون لطیفہ کی خوبیاں سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

جو بچہ ابتدا ہی سے عمدہ تصاویر دیکھتا ہے تو اس کو ان کی شناخت کی عادت پیدا ہو جاتی ہے تو اس وقت وہ رنگین یا چمکیلی تصاویر کو پسند نہیں کرتا۔ اس کا مذاق عمدہ اور نفیس تصاویر دیکھنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اس سے کم درجہ کی شیئے پسند نہیں کرتا۔ ایک عمدہ نمونہ مصوری کو دیکھکر اس کو خوشی ہوتی ہے اور پھر رنگیلی تصاویر تنفر پیدا کرتی ہیں۔ یہ اس لئے نہیں کہ وہ فطری طور پر اس سے بے پرواہ بلکہ وہ اعلیٰ شہ پاروں کی قدر و قیمت کو سمجھنے لگا ہے۔

مدارس اور مکانوں میں صرف درجہ اعلیٰ کی تصاویر کا رکھنا اور بچوں کو ان کے متعلق کچھ بتلانا کافی نہیں ہوتا بلکہ اگر وہ ان کی خوبیوں کی طرف متوجہ بھی کئے جاویں تو صرف اس قدر کہ ان کا مفہوم و مقصود سمجھ جاویں اور ان کو یہ بھی خیال ہو کہ کتنا استقلال اور کس قدر وقت ان کی تیاری میں صرف ہوا ہوگا۔ معمولی طور پر بچوں کو قبل اس کے کہ ان کا مذاق خود ہی درست ہو اس کی طرف توجہ دلانا چاہیئے۔ تاکہ ان کا مذاق صحیح ہو سکے لیکن کیا تصاویر کی تربیت ان کی خوبیوں کا احساس اس کو کرا دے گی نہیں اس وقت قصہ گوئی نہایت تعجب خیز کام کر سکتی اور اس طرح ہم بچے کی دلچسپی کو دوبالا کر سکتے ہیں۔

فنون کے میدان میں سوانحی قصہ جات غیر معمولی طور پر قیمتی ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایک صناع کی زندگی کے حالات اور اس کے شہ کاروں کی نقل پیش ہونے پر ان میں احساس پیدا ہونے کا راستہ کھل جاتا ہے۔ صناعی کی خوبیوں کے پرکھنے کا معیار معتزر

کرتے ہیں بچوں کی دلچسپیوں کو مدنظر رکھنا چاہیئے کیونکہ بہت سی تصاویر جو بہتر تو ہوتی ہیں لیکن انہیں بچوں کو دکھلانا بے کار ہوتا ہے۔

قصہ گوئی اور تعلیم مذہب تعلیم کا کام نہ صرف علم سکھانا یا ایسی قابلیت پیدا کرنا ہے جس سے آئندہ مزید ترقی علم ہو سکے اور جس سے وہ اپنی زندگی کی جدوجہد کر کے کامیابی تک پہونچ سکے بلکہ اس کو اس درجہ کی مذہبی تعلیم بھی دینا ہے جو اس کو دوسرے انسانوں میں زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دے تاکہ اوروں کے جذبات کی قدر کرنا سیکھ لے۔ جیسا کہ گوئٹے نے کہا ہے "اپنے سے بڑوں کی توقیر چھوٹوں کی عزت اور برابر والوں کی قدر کرنا" اس کو یہ سکھانا چاہیئے کہ وہ یہ جان سکے کہ خود اس کی ہستی ایک بڑے کل کا جز ہے اور شخصی خواہشات سے بہتوں کا بھلا ہوتا ہے۔ اس کو یہ بھی سکھانا چاہیئے کہ ایک فرد کی حیثیت سے اس کے ذمہ سوسائٹی کے کچھ فرائض ہیں۔ سوسائٹی میں جو قوانین ہوتے ہیں اُن کی اطاعت اور ان اصولوں کی پیروی جن سے ایک خاندان مشترکہ طور پر خوشی سے بسر کرتا ہے شہری اور قومی زندگی کیا ہے۔ ہر ایک مدرس کو چاہیئے کہ وہ مذہبی تعلیم میں اس بات پر خاص توجہ دے کہ کیا حق اور کیا غلط ہے جس کو عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور ان ہی خیالات کو ایسی پختگی کے ساتھ ذہن میں جمانے کی کوشش کرے جس سے وہ نقش کالحجر ہو جاویں۔

مذہبی معیار قائم کرنے میں بھی بالکل اسی اصول پر چلنا چاہیئے جیسا کہ فنون لطیفہ ادب یا موسیقی کے لئے ضروری ہے۔ ہم کو اس کے عقلی جذبات کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور اس کو یہ معلوم کرانا چاہیئے کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے وہی صحیح ہے۔ بعض اوقات یا نصائح پیش کرنے پر یہ کام پورا نہیں ہو سکتا۔ ہر مدرس اس سے واقف ہے کہ جو وقت بچے کو ہدایات دینے میں صرف ہوتا ہے اس کا نتیجہ بہتر نہیں ہوتا تو اس کے لئے ان کو کیا کرنا چاہیئے۔ اس کو صرف یہ سنا دینا کہ تم فلاں کام کرو اور فلاں مت کرو کافی نہیں ہے

جس وقت اس کو حکم دیا جاتا ہے تو خوف کی وجہ سے اس کی اطاعت کرتا ہے لیکن یہ ٹریننگ اس کے کردار کو جو قوت کا نتیجہ ہے مضبوط نہیں کر سکتا۔ اور نہ کسی کام کے اعلیٰ معیار تک پہونچا سکتا ہے۔ وہ بچے کو ضدی کر کے اور بھی سخت کر دیتا ہے کہ وہ پہلی اول موقع پر ان احکام کی خلاف ورزی کرے۔ مذہبی تعلیم کا یہ منشا نہیں ہے کہ بچے کو روکیں بلکہ اس کو اس قدر روشن خیال بنا دیں کہ وہ اس نقطہ پر پہونچ کر خود ہی اپنی محافظت کرے مہیا کرکسی کا قول ہے کہ اس کا مقصد بہترین نفع اٹھانا ہے۔ وہ اس قدر ترغیب کن ہے کہ بچہ اس کو بڑے شوق و محنت سے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ جو خیال اس کے پیش نظر رکھتا ہو وہ ایسا خوبصورت ہو کہ اس کے حصول کے لئے وہ ہر قربانی اور سختی اٹھانے پر تیار ہو جاوے۔ اس لئے ذریعہ قصہ خوانی اس کو اس منتہائے نظر کی طرف لے جانا چاہیئے جس سے وہ نہایت صفائی سے بہ نسبت کسی دوسرے طریق کے سمجھ سکتا ہے۔ کیوں کہ قصہ اچھے کاموں کی ترغیب دیتا اور برے افعال سے نفرت دلاتا ہے۔

مذہبی تعلیم دینے میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ مضمون صحیح طور پر اخذ کیا جاوے اور جو قصے اس کے لئے استعمال کئے جاویں اس کے سن کے لحاظ سے بھی موزوں ہوں اور ہر قصہ میں ایک سبق آموز شئے ہونا چاہیئے جس کو لڑکے لڑکیاں پڑھ کر ایک مضبوط اور سچی زندگی گذارنے کے قابل ہو جاویں۔ اخلاقی تعلیم گود ہی سے شروع ہونی چاہیئے اس کے لئے ماں یا مدرس کو ابتدائی قصہ جات کی ضرورت ہے۔ جن کی مذہبی قدر ہو۔ ان کو اتنی ہی جلد شروع کرنا چاہیئے جتنی کہ جھولے کے قصص شروع ہوتے ہیں بالکل ابتدا ہی میں بچے کو اس یقین پر لانا چاہیئے کہ دنیا میں ایک اعلیٰ قانون بہ نسبت اپنی مرضی یا خوشی کے بھی موجود ہے۔ اس کو اطاعت سکھانا صفائی جانوروں پر رحم۔ حق العباد کی نگہداشت سچائی محنت ایمانداری اور خلق لازمی ہے۔ اور یہ اسباق سوائے قصہ گوئی کے کسی دوسرے طریقہ پر بچہ کے ذہن نشین نہیں کئے جا سکتے۔

ایسے قصص جن میں بچوں کو نقدی انعامات دیئے جاتے ہیں تو ان میں بیان کرنے والے کو اس بات پر زور دینا چاہیئے کہ سب سے بڑا انعام وہ اطمینان دلی ہے جو کسی اچھے کام کو انجام دینے پر حاصل ہوتا ہے۔ کیوں کہ جو بچہ زیادہ تر مادی انعام کا ذکر سنتا رہتا ہے تو اکثر اس کو یہ خیال ہوتا ہے کہ روپیہ یا مٹھائی اچھے لفظوں میں اعتراف ہی اچھے کاموں کا صلہ ہے اگر کسی وقت اس کو انعام نہ ملا تو وہ اچھے کاموں ہی کو شروع سے بے فائدہ خیال کرنے لگتا ہے۔ بہت سی حکایات یا پریوں کے قصص خاصی مذہبی قیمت رکھتے ہیں۔ اور بیان کنندہ عام ادب سے بہت کچھ اخذ کر سکتا ہے۔ تاریخ و سوانح عمریاں خصوصاً نہایت درجہ زر خیز ثابت ہیں۔ جن سے بڑے لڑکوں کے لئے مصالحہ فراہم کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ کوئی شے ان کی سمجھ میں اور ان کے دل پر اس قدر مؤثر نہیں ہوتی جتنا کہ حب الوطنی کا ایک سبق۔ وفاداری۔ خیر خواہی۔ بہادری یا اطاعت جن پر چل کر ایک شخص جو آزمائش میں پورا اترا اور کامیاب ہوا۔ اس کے حالات پڑھنے میں ہوتا ہے۔

قصہ گوئی تاریخ کے ذوق کو بڑھاتی ہے

یہ کہا گیا ہے کہ جو لڑکا سو میں سو فیصدی نمبر حاصل کرے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کو شکسپیر سے نفرت ہو تو وہ ناکامیاب ہے لیکن حقیقت میں ناکامیاب وہ مدرس ہے جس نے اس کو تعلیم دی۔ اور وہ یوں صحیح ہے کہ وہ مدرس جس کا کام محض تاریخ کے غیر دلچسپ واقعات یا مشہور تاریخ و سنین کا شمار بہ نسبت ایک رنگین قصے کے ہو وہ ضرور ناکامیاب ہے۔ تاریخ کی تعلیم کامیابی سے دینے کا مفہوم یہ ہے کہ واقعات کی متحرک تصاویر بچے کے سامنے پیش کی جاویں۔ اس کو یہ دیکھنے کے قابل بناتا ہے کہ ساری قوم کی مجموعی رفتار زمانے میں کیا ہے۔ جنگجو لوگوں کی شکست و فتح کو دیکھنا۔ بڑے بڑے مدبران کی آوازوں کو سننا جن کی عقل نے سلطنتیں قائم کیں اور ان مردوں یا عورتوں کے ساتھ سیر کرنا جن کی زندگی کے قصص نے دنیا کی تاریخ مرتب کی ہے۔ بچے کے لئے ان چیزوں کو مفید بنانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ

ان کو اسی طرح محسوس کرے جس طرح ادبی خوبیوں کو محسوس کرتا ہے۔ اس کو اس امر میں محدود رہنا چاہیئے کہ لائق ہستیوں کو قبول اور نالائقوں کو رد کرے اور کرداروں کے ساتھ ان کی خوش نصیبی یا بدبختی پر ہمدردی کرے۔ اس کے علاوہ کوئی اور شئے مثل تاریخی جنتری جو اوقات مدرسہ میں تو کیفیت دہ ہوتی اور ختم پر بالکل نسیاً منسیاً ہو جاتی ہے ان کے لئے موزوں نہیں ہے۔

قصہ گوئی بچہ کو تاریخ سے نسبت دیتی ہے اور وہ اس کے ذریعہ سے زمانہ گذشتہ میں پہونچ جاتا ہے اور اس وقت اس کی حیثیت نہ صرف ایک تماشائی کی ہوتی ہے بلکہ وہ تمام انسانی حرکات و اعمال میں حصہ لیتا ہے۔ اگر ہمارے تمام کتب خانے چھین لئے جاویں اور تمام دار الاشاعت بند ہو جاویں تب بھی ہم بچوں کو تاریخ سکھا سکتے ہیں اور نہایت کامیاب طریقہ پر قصہ گو کے ہنر سے کام لے سکتے ہیں۔ ہم قصے کے ذریعہ بچے کو سکھا سکتے ہیں کہ ان کے اجداد نے زمانہ گذشتہ میں کیا کیا اور اسی ذریعہ سے ان کے طرز معاشرت کو بھی دکھا سکتے ہیں۔ اور دوسرے لوگوں نے کیا کرنے کی ہمتیں کیں جن کو وہ خواب کر رہے اور ایک زندہ طریقہ انسان کے رہنے سہنے اور چال چلن کا بتا سکتے ہیں عام معنوں میں یہی تاریخ ہے جس کو قصہ گو زمانہ قدیم میں تعلیم کرتے تھے۔

مطابع کے زمانے سے قبل ہر جگہ کتب صرف قلم ہی سے لکھی جاتی تھیں۔ اس وقت سوائے براہمنوں کے کوئی نہ پڑھتا تھا اور سوائے بادشاہوں کے کسی کو میسر نہ آتی تھیں اس وقت سوائے قصہ خوانی کے کوئی دوسرا ذریعہ تاریخ کی تعلیم کا نہ تھا۔ محلوں کے ہال پرانے زمانے کے قصص سے گونجتے تھے۔ گانوں کے سبزہ زاروں میں لوگ مجتمع ہو کر ان کو ذوق سے سنتے تھے۔ بادشاہوں اور امرا کے زمانہ کے بچے اپنے ملک کے قصص دربدر پھرنے والے بھائیوں کے ذریعہ واقف ہوتے تھے لیکن ہمارے زمانہ والے اب صرف کتابوں کو پڑھ کر جان سکتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ انہوں نے قصوں میں

نا ہے اس کو دوبارہ زندہ کر سکتے ہیں اور جو کچھ سابق میں پیش آچکا ہے آئندہ بھی ہو گا ہونا ممکن ہے۔ آج کل کے بچے بھی مثل زمانہ سابق کے بچوں کے دنیا کے قصے کو زندہ کر سکتے ہیں اور تاریخی قصص کو بچوں کی دلچسپی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔

بچے کی اول توجہ صرف روزمرہ کی چیزوں کی طرف مرکوز ہوتی ہے اور اس ذریعہ سے وہ انجانی ہوئی چیزوں کی طرف منتقل ہوتی ہے کنڈرگارٹن کے بچے اول اپنی قریب کی اشیا سے دلچسپی لیتے ہیں بعد میں دوسرے مقامات کی طرف خود ہی رجوع کرتے ہیں۔ مرد۔ عورت۔ بچے۔ جانور دوسرے بچوں کی زندگی کا جز ہوتے ہیں۔ اپنی قریب کی چیزوں کے علم کے بعد دوسرے مقامات کی اشیار کی زندگی کا علم ان کو حاصل ہوا ہے۔ اس کی قوت متخیلہ کو توجہ دلانے سے وہ سمجھنے لگتا ہے جس سے اس کی ہمدردی اور سماجی رجحان کو ترقی ہوتی ہے۔ اس لئے تاریخ کی تعلیم میں اپنی گرد و پیش کی اشیار کے علم کے بعد اس کو دنیا کے دیگر حصص میں پہونچنا چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ بچہ جو کچھ اپنے ماحول میں ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اس سے زمانہ گذشتہ کے واقعات کی طرف رہنمائی کرنا چاہیئے اور نیز یہ کہ دوسرے دور دراز ممالک میں کیا ہو رہا ہے۔ اس طرح اس کی قوت متخیلہ کو ترقی ہوتی ہے۔ اور لڑکے لڑکیوں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا لیکن جب خشک تاریخی بحث ان کے سامنے پیش ہوتی ہے تو غور و فکر کی عادت اس سے پیدا نہیں ہوتی۔ واقعات مثل پردہ پر رنگین تصاویر کے ان کو دکھلائے جائیں اور یہ صرف قصہ گوئی کے ذریعہ سے ممکن ہے جو خیالی اشیاء کو اصلی بنا سکتی ہے جن کا بوجہ بغیر تجربہ ممکن نہیں ہے اس لئے ذریعہ قصہ گوئی نہایت آسانی کے ساتھ ان کو دکھا سکتے ہیں اور جو کچھ ہم اون کو معلوم کرانا چاہتے ہیں بتلاتے ہیں۔

سوانحی قصص یا کسی بڑے رہنما کا قصہ جو اپنے ہمجنسوں سے بہت اونچا ہو گیا ہو۔ مثلاً Snettauhren کے جو Valais کی پہاڑی کے

دامن میں واقع ہے وہ تاریخ کے معلمین کے لئے فائدہ مند ہے۔ اس کے طریقے کی حیثیت ڈرامے کی طرح توجہ کو منعطف کراتی ہے اور تمام تاریخی مواد نہایت آسانی و آزادی کے ساتھ کام میں لایا جا سکتا ہے۔ پس اگر بچہ کو تاریخ انسانی سکھانا ہو تو ان کو صرف سوانحی قصص پر محدود نہ رکھنا چاہیئے۔ بلکہ عوام نے جو حصہ تاریخ انسانی کے مرتب کرنے میں لیا ہے اس کا بھی خیال دلانا چاہیئے۔ انگلستان کے عوام جن کے قوی بازوؤں پر اس کی آزادی منحصر ہے یا وہ گمنام فوج جس نے اہرام مصری اور دیوار چین کو بنایا ہے وہ بھی قابل توجہ ہیں بعض بچوں کو ہیرو (HERO) سے محبت کرنا سکھاتے ہیں صرف شخصی کمالات پر زور دے کر ہم یک رُخا بنا دیتے ہیں۔ پس جو مدرس تاریخ کو دلچسپ بنانا چاہتا ہے تو اس کو اپنی معلومات کو قصص کی صورت میں ڈھال کر پیش کرنا چاہیئے اور مستند مؤرخوں کی مدد لے کر تصویر کا پس منظر تیار کرنا مناسب ہے جس سے اس کی کوشش رائیگاں نہ جائے وہ ہر قصے کو بالکل ایک جیتی جاگتی صورت میں پیش کر سکتا ہے جن کو بچہ خوشی خوشی پڑھ لے گا اور اس کا تاریخی سبق اپنے اصلی معنوں میں سمجھا جا سکے گا۔ یہ شئے ان کے لئے ہزاروں تاریخوں اور واقعات کے خوانوں سے بہتر ہو گی جو صرف امتحان میں کامیابی کے لئے رٹ لئے جاتے ہیں اور وہ تمام بے کار پڑے پڑے ضائع ہو جاتے ہیں۔ نہ تو ان کے کچھ معنی ہوتے ہیں اور نہ وہ درستی دماغ میں کوئی مدد دیتے ہیں اور نہ ان کا اثر اس کی زندگی پر پڑتا ہے۔

لیکن اگر مدرس انہیں واقعات کو ایک جیتے جاگتے یا رنگین قصوں کی صورت میں پیش کرتا ہے تو اس سے زائد کوئی شئے دلچسپ نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ دنیا کے قصص کا کوئی صفحہ ایسا نہیں ہے جو بچے کے لئے دلچسپ نہ ہو۔ خواہ وہ بحر منجمد شمالی کا ذکر ہو یا قطب جنوبی کا۔ خواہ وہ مسلح فوجوں کے چمکدار ہتیاروں کا ہو یا بھولی بھالی صورت والے فقیروں کا۔ عوام سے متعلق ہو یا امراء سے لیکن وہ سب اس میں روح پھونکنے والے

ہوتے ہیں۔ وہ ایسی اطلاعات مہیا کرتے ہیں جو بچے کے لئے ضروری ہیں۔ جن سے اس میں ایسی سمجھ پیدا ہو جائے گی جو تاریخیں یا خاکے نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ وہ ان لوگوں کے ہمراہ رہا ہے جنہوں نے تاریخ بنائی ہے۔

ہر بڑا مورخ زمانہ گذشتہ کے واقعات شماری سے کہیں زیادہ حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک ایسا صناع ہے جو ان مردوں یا عورتوں کو اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہے جو زمانہ سابق میں گذرے اور اپنے کاغذات میں گوشت اور خون کی مخلوق پیدا کر دیتا ہے۔ اور ان میں اس قدر تازگی اور دلچسپی ہوتی ہے گویا کہ یہ سارے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے گذر رہے ہیں (Hallam, Hume, Puget, Motley Hugo) نے تحقیق نہایت شاندار طریق پر کی ہے۔ جیسا کہ (Parkman, Froude, Balzac یا Corneille) نے پیدا کیا تھا۔ ان لوگوں نے اصلی کرداروں کو اسی شان سے پیش کیا جیسا کہ اگلے لوگوں نے نہیں ان کو یہ سمجھانا چاہیئے کہ ایک شخص بلا تلوار باندھے ہوئے یا گھوڑے پر سوار ہوئے بغیر بھی ملک کی خدمت کر سکتا ہے۔ ہم بطور تمثیل یہ بتاتے ہیں کہ (Robert Fulton) نے اول اول دخانی جہاز ایجاد کیا۔ وہی ایک غیر معمولی رہنما بچہ تھا۔ جس نے اس واقعہ سے فائدہ اٹھایا اور نوجوان کو دکھلانے کے لئے پھریرے اڑاتا پھرا۔ اس کے ناکامیابی یا فتح و شکست کے قصے یا یہ واقعہ کہ (Clermont) نے نیو یارک سے ویسٹ پوائنٹ ۱۸۰۷ء میں کامیابی سے سفر کیا۔ لیکن اس قصہ کو بیان کرنے میں درمیانی ابواب کے بغیر صرف اس کا کوئی قصہ اپنا پورا اثر نہیں دکھلاتا۔ لیکن بچوں کو اس شاندار ایجاد کے تمام روشن دنوں کا ایک پہلو بتلانا چاہئیں لیکن جب ہم اس کی ولادت یا (Peine) کے کنارے کی شفقت امید، نامرادی کے تمام حالات جو اس کو پیش آئے بیان کرتے ہیں تو سارا قصہ نہایت دلچسپ اور ناقابل فراموش ہو جاتا ہے۔ وہ (Clermont) کے

قصے کو صرف اس لئے یاد رکھتے ہیں کہ جیسی ہی گمات پر ان کو کشتیاں دکھائی دیتی ہیں یا سمندر میں جہاز نظر آتا ہے اس وقت (Clemenceau) کے بچپن کا قصہ ان کے دماغوں میں تازہ ہو جاتا ہے جس کی بدولت یہ شئے پیدا ہوئی تھی۔

مدرس جو تاریخ کو ایک دلچسپ قصہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کو محض واقعات کا مجموعہ خیال نہیں کرتا، اور جو انسان کی اندرونی و بیرونی قوا کی ترقیوں سے واقف ہے۔ جو اپنے گھڑے ہوئے فرضی قصوں کو دلیر بہادری کے قصص بھی جانتا ہے بہیچ قصص کو زیادہ روشن کرنے کے لئے ان کو چمکاتا ہے جن سے بڑے بہتر نتائج کا امکان ہے۔ تاریخ کا کوئی زمانہ یا پہلو ایسا نہیں ہے جو قابل نظر انداز ہو۔ بچوں کو ان خاکساروں کے کام کی بھی قدر و قیمت بتلانا چاہیئے جو صرف محنت مزدوری سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ ہم کو صاف طور پر یہ دکھلانا چاہیئے کہ جو شخص جنگی جہاز کی بھٹی میں کوئلہ جھونکتا ہے وہ بھی ویسا ہی محب وطن ہے جیسا کہ ایک امیر البحر۔ اس کی بھی ایسی ہی ضرورت ہے جیسا کہ امیر البحر کی کیونکہ بغیر ان کے بیڑہ نہیں چل سکتا۔

اکثر اوقات تاریخ میں جنگی واقعات زیادہ تر نظر آتے ہیں اور صلح و آشتی کے کام کم دکھائی دیتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف جنگی اور بہادری کے ہی کام نہایت اہم ہیں ہم اکثر بچوں کو یہ یقین دلانے میں ناکام رہتے ہیں کہ صوبہ لودیں کے کسان جو اپنی محنت سے غلہ پیدا کرتے ہیں وہ بھی اسی طرح ملک کے خیر خواہ ہیں جس طرح وہ فوجیں جو اپنے افسران کے زیر حکم جنگ کے لئے پیش قدمی کرتی ہیں اور کامیاب ہوتی ہیں۔ ہمارا معلم بجائے صرف بچوں کو جنگی واقعات سکھانے میں رہتا ہے لیکن امن و امان کی برکتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہر جدید صنعت کی تاریخ بھی جو دنیا کے لئے مفید ہے ایک طویل قصہ مخالف طاقتوں کی کامیابی و ناکامی کے جھگڑوں کا ہے۔ ان میں بھی واقعات کا تسلسل اور فتح و شکست کے اوقات اور مد و جزر کے حالات ہیں جو اگر اپنے تمام امکانات میں پیش نظر رہیں تو

وہ بھی یاد کے لڑکیوں کے لئے ویسے ہی دل چسپ ہوں گے جیسا کہ روس پر نپولین کا
حملہ۔ اس قسم کے لڑائیوں کے واقعات سے ہرگز غفلت نہ برتنا چاہیئے جو انسانی ذہن کے
دھبوں سے ملوث نہیں ہیں۔

قصہ گوئی جغرافیہ میں دلچسپی پیدا کرتی ہے

تعلیم جغرافیہ میں بھی قصہ ویسا ہی کارآمد ہے جیسا کہ تاریخ میں کیوں کہ
بچے کو اپنے ارد گرد کے کاموں سے دل چسپی ہوتی ہے لیکن جب
اس کو یہ علم ہوتا ہے کہ امریکہ۔ آسٹریلیا یا روس میں بھی لوگ یہی کام کر رہے ہیں جو وہ اپنے
ملک میں ہوتے دیکھتا ہے اور وہ لوگ بھی مثل اس کے باپ چچا یا ہمسایوں کے انہیں مشغول
میں مشغول ہیں تو فاصلہ کا اثر اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے اور جس ملک سے اس کا
تعلق سب اس کے قریب اور حقیقی ہو جاتے ہیں۔ جغرافیہ عام معنوں میں اس خیال یا احساس کا
نام ہے جو غیر ممالک میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا ترجمہ ہوتا ہے۔

یہ تمام کام قصہ کے ذریعہ سے بخوبی انجام پا سکتا ہے۔ اور اس مضمون کے سکھانے
میں وہی زائد قیمتی شے ہے یہاں رام کہانی پریوں کے قصص نہایت کامیابی سے استعمال
ہو سکتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے بچہ دنیا میں انسانی جدوجہد کو دیکھ سکتا ہے اور اس سے
دوسرے ملکوں کے لوگوں کے خیالات سے زائد ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ
بہتیری تمثیلات میں بعض مستقل اطلاعات خاص مقامات کی حاصل ہوتی ہیں۔ اور دور دراز
مقامات کی زندہ تصاویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔ جو بچہ الف یاب کی حالتوں
میں پہاڑوں کے قصص سنتا ہے اور وہاں کے لوگوں کے بہادری کے کارناموں سے
واقف کرایا جاتا ہے اس کے نزدیک نقشہ میں یہ چیز ایک معمولی سیاہ دھبہ نظر نہیں
آتیں۔ جب وہ سنتا ہے کہ دو مینڈک جاپان سے دنیا کی سیر کو نکلے۔ تو وہ یہ ہرگز نہیں
کہہ سکتا کہ کیا ٹو جنوبی امریکہ میں ہے کیونکہ وہ مقام قصہ کے ذریعہ سے اس کے دماغ
میں ثبت ہو گیا ہے۔ اور وہ اس شے سے متعلق ہے جس سے اس کو تفریح حاصل ہوئی

وہ وہیں رک جاتا ہے اور چونکہ جغرافیہ کا منشا صرف دماغ میں خالی خولی واقعات کا ٹھونس دینا نہیں ہے بلکہ اس کے افق کو بڑھا کر اس کو ساری دنیا اس کے قرب وجوار کے مقابل کرنا ہے اس لئے اس کو ایسی اطلاعات بہم پہونچانا چاہیئے کہ جس سے اس کا منہاج نظر وسیع ہو سکے جس سے تمام دنیا کے لوگ اس کے قریب ایک مخلوق نظر آنے لگیں۔ اور سارے کام خود اس کے تجربہ کئے ہوئے معلوم ہوں۔ بعض اوقات مدرسین اس واقعہ کو بھول کر بڑا وقت زبانی واقعات کے رٹانے میں صرف کر دیتے ہیں جس سے اس کا سارا منشا فوت ہو جاتا ہے۔

جغرافیہ و تاریخ ایک دوسرے سے بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کو ایک دوسرے سے علحدہ کرنا مشکل ہے اس لئے ایک مضمون کو زندہ بنانے میں دوسرے سے نہایت درجہ مدد مل سکتی ہے۔ قصہ کے استعمال کی ایک قدر یہ بھی ہے کہ تاریخ یا جغرافیہ کا پس منظر پیش کرنے پر بچے کے ساجی جذبات کو ترقی ہوتی ہے اور تمام انسانی برادری کا تخیل پیدا ہو جاتا ہے۔ سننے پڑھنے میں وہ نہایت روادار ہو جاتا ہے۔ وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ تمام ملکوں کے انسان خواہ کتنے ہی مختلف الخیال کیوں نہ ہوں عزت کے مستحق ہیں۔ کیوں کہ وہ نہایت درجہ گہرے اعتماد اور خواہشات پر مبنی ہوتے ہیں۔ بجائے دنیا کو تنگ نظری سے دیکھنے کے وہ بلا رکاوٹ وسیع میدانوں کو دیکھتا ہے جس سے انسانی ادراک بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اور جغرافیہ کے پڑھنے میں اس کا زائد موقع حاصل ہوتا ہے جو کسی دوسری جگہ بمشکل ہاتھ آسکتا ہے۔ ابتدائی تعلیم میں بچہ قوموں کو ایک تنگ راستہ یعنی صوبہ داری میں منقسم دیکھتا ہے لیکن اس کو بہت جلد اس سے ہٹا کر شہریت کی فراخ شاہراہ پر لگانا چاہیئے۔

جس طرح تاریخ کے پڑھنے میں اسی طور پر جغرافیہ میں بھی قصہ کو مقامی اطراف سے شروع کر کے اس کو دنیا کے دیگر مقامات تک لے جانا چاہیئے۔ اور ہر ایک شخص

جس کو بچوں کے درمیان کام کرنا ہوتا ہے اس کا فرض ہے کہ مقامی تاریخ کا کچھ خیال بھی
ان کو دلاوے۔ بچہ کو ان ابتدائی آدمیوں کے قصص معلوم ہونے چاہئیں جو اول اول اس
ملک میں بستے تھے جن کی یادداشتیں و آثار اب تک ملک کے مختلف مقامات پر پائے
جاتے ہیں۔ اور مدرسین کو ان کے گرد و نواح کے قصص بچوں کے کانوں تک ضرور
پہونچانا چاہئیں۔ یہ قصے نہ صرف ان کی دلچسپی کو بڑھائے گی بلکہ دوسرے ممالک اور
قوموں کے سمجھنے میں وسعت پیدا کرے گی۔ اور ان کو مختلف لوگوں کی جد وجہد سے
ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ اس قسم کا کام اگرچہ تاریخ سے متعلق ہے لیکن جغرافیہ میں بھی
وہ دلچسپی پیدا کر سکتا ہے اس لئے ایسا مفید مضمون مدرسین کو ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہئے
جغرافیہ میں مدرس کو صرف قصہ ہی نہ سنانا چاہئیے بلکہ مقامات جن کا ذکر اس قصے میں آوے
ان کو بھی نقشہ میں دکھا کر اس کو فتح کرنا چاہئیے۔ تاکہ ان کا صحیح مقام و قوع بچوں کی نظر
دماغ میں معین ہو جائے۔ قصہ کی دلچسپی اس کے کام شغل ایک کھیل کے بنا دے گی
اور محنت کے بجائے اس کی خوشی کا سبب بن جائے گی اور اس کو وہ اس طرح حاصل
کریگا جس طرح وہ اپنے باپ یا چچا کے ہمراہ کسی سفر یا تفریح کے لئے جانے کا ارادہ رکھتا
ہے۔ ایک سے زائد مرد و عورت نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ جو کتاب مدرسہ
میں پسند کی جاتی ہے اس کا درجنوں گھنٹوں اعادہ اس قدر کارآمد نہیں ہے جتنا کہ قصص
شہروں، پہاڑوں و دریاؤں کے صحیح مقام وقوع اور ریاستوں کے صحیح حدود ذہن میں
بٹھا سکتے ہیں۔ جو ان کو تمام عمر فراموش نہیں ہوتے۔ اور عمر بھر میں وہ جہاں کہیں سفر کرتا
ہے مگر بچپن کے قصص سے متعلق وہ مقامات راستہ میں پڑتے ہیں تو اس کو غیر معمولی
مسرت ہوتی ہے۔ تعلیم ذریعہ قصہ گوئی ملک میں ایک بڑا ذہنی انقلاب پیدا کر سکتی ہے۔

مؤثر تعلیم

موجودہ سلسلۂ تعلیم محض علمی و اصولی ہے عملی نہیں تکمیل نصاب تعلیم کے وقت معیار بالکل ہمارے پیش نظر نہیں رہتا کہ طلبا کو ترک مدرسہ کے بعد دنیا کی حقیقی تعلیم گاہ میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ ہمارا طریقہ تعلیم اس امر کو نظرانداز کرتا ہے ہم کو سب سے پہلے یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم دنیا میں جہاں اُسے زندگی بسر کرنی ہے کامیابی کے ساتھ عمر گذارے۔

محض پڑھانا تعلیم دینا نہیں ہے۔ طالب علم کے دماغ کو محض معلومات کا ذخیرہ بنانا جس کو نہ تو معلم اور متعلم سمجھ سکتا ہے بلا لحاظ اس کے کہ وہ مفید ہے یا مضر یا فضول ہے۔ و نیز یہ کہ متعلم اس کو بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ یہ ایک کہاوت ہے کہ علم میں قوت ہے لیکن یہ اسی وقت قوی الاثر کہلایا جاسکتا ہے جب کہ اس قوت کو کام میں لایا جائے عمل کے بغیر علم اصول بغیر مشق سائنس کے بغیر فنون کوئی معنی یا مفاد نہیں رکھتا۔ سقراط نے کہا ہے کہ علم ایسی قوت ہے جس پر عمل کیا جائے اور اس سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ کسی کام کے کرنے کا طریقہ بتلایا جائے بلکہ اس میں وہ ذکاوت بھی شامل ہے جو حصلہ علم کو عملی جامہ پہنانے میں مشتمل ہے۔ اسی طرح ایک سنسکرت شاعر نے کہا ہے کہ کتب کے مطالعہ کے بعد بھی یہ ممکن ہے کہ انسان محض بے وقوف رہے۔ لیکن وہ جن کے اعمال نیک ہوں فی الواقع عقلمند ہیں"۔

اس قسم کی قوت عملیہ خواہ وہ انگریزی ریاضی جغرافیہ یا کسی اور مضمون سے متعلق ہو صرف مطالعہ کتب اور سماعت لکچرز سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ساتھ ہی ساتھ ان اصول کو مدنظر رکھنے سے کہ حصول علم کے بعد اس پر عامل بھی رہنا چاہیئے۔ یا یہ کہ تعلیم فوائی کوشش سے

حاصل کی جائے۔ انسان کی مضمر خوبیوں کو کام میں لانے کی بہترین کلید یہ ہے کہ عملی کام اور کھیل کے ذریعہ تعلیم دی جائے۔

ہربرٹ اسپنسر نے تعلیم کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ کامل زندگی بسر کرنے کی تیاری ہے۔ انسان کی زندگی کے سات پہلو ہوتے ہیں یعنی جسمانی، دماغی، اخلاقی، مدنی، سوشیل، احساسی، اور روحانی۔ ان قویٰ کی نشوونما ضروری ہے۔

تعلیم شخصی اخلاق کے نشوونما میں امداد دینا چاہئے لیکن ہم کسی متنفس کا قیاس نہیں کر سکتے کہ وہ سوسائٹی سے الگ تھلگ رہ کر نشوونما پائے اور زندگی بسر کرے۔ انسان ایک معاشرتی جانور ہے اور وہ بغیر سوسائٹی کے نہیں رہ سکتا۔ اور سوسائٹی کا تصور بغیر انسان کے ناممکن ہے۔ تعلیم کے دو مقاصد ہونے چاہئیں۔ ایک یہ کہ انسان کو کامل بنائے اور دوسرے یہ کہ قوم کی بہبودگی ہو۔ بالفاظ دیگر تعلیم کا عندیہ یہ ہے کہ انفرادی اخلاق کی شدھار ہو اور انسان متمدن ہو۔

لہذا مدارس کی تعلیم کا مقصد طلباء کے اخلاق کو سدھار کر مستحکم کرنا۔ زیر تعلیم طلباء کی قوت تفہیم کو نشوونما کرنا اور مدرسہ کے اوقات کو طلباء کی امداد میں ان کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر بہترین طریقہ سے صرف کرنا ہے۔ تاکہ وہ علمی و عملی طور پر دنیا کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کے قابل ہو جائیں۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر مدرسے میں اساتذہ کے فرائض یہ ہونے چاہئیں۔

(۱) طلباء کو مشاہدہ اور صحیح استدلال کا عادی بنائیں۔ تاکہ وہ قانون قدرت کا مطالعہ نہایت سرعت سے کر سکیں۔

(۲) انسان کے نصب العین اور کامیابیوں کے راز دریافت کرنے میں ان کے دل میں حقیقی شوق پیدا کریں۔

(۳) ان کے ملک کی تاریخ اور ادبیات سے ان کو بخوبی واقف کرائیں۔

(۴) ان میں اس قدر علمی قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کریں کہ وہ اپنے

معاملات کو بہترین طریقہ سے ادا کر سکیں۔

(۵) عمدہ کتب کے مطالعہ اور ان کو بغور پڑھنے کا ان میں ذوق پیدا کریں تاکہ وہ اپنی ذاتی کوششوں سے آیندہ اپنے معلومات میں اضافہ کر سکیں۔

(۶) ساتھ ہی مدرسہ میں عملی کام اور دستکاری سے اُن کے آنکھوں اور ہاتھوں کی مشق کرنے کی رغبت دلائی جائے۔

(۷) اور ہر ممکنہ طریقہ سے یعنی نہ صرف ورزش جسمانی اور باضابطہ کھیلوں میں ان کو شریک کرنے سے بلکہ مدرسہ میں ہی میں صحت کے چند معمولی اُصول کو کام میں لانے سے اُن کی قوائے جسمانی کے نشو ونما کا موقع دیا جائے۔

(۸) مدرسہ کا یہ بھی ضروری گو کہ ضمنی مقصد ہے کہ ایسے طلبا کو معلوم کریں جن میں غیر معمولی قابلیت کے آثار پائے جاتے ہوں اور ان کی خاص ذاتی خوبیوں کی نشو نما کریں (حالانکہ کثیر تعداد طلبا کے مفاد کا خیال نہ کرکے محض اسی پر زور دینا بے سود ہے) تاکہ وہ بروقت کسی موزوں مدارس میں تعلیم پا سکیں اور اس تعلیم سے متمتع ہو سکیں جو ان کو وہاں دی جاتی ہو۔

(۹) طلبا میں اساتذہ نیک اخلاق کی بنیاد ڈال سکتے ہیں حالانکہ ان کو طلبا کے ساتھ رہنے سہنے کا زیادہ موقعہ نہیں ملتا۔ وہ اپنی ذاتی مثال اور اثرات سے نظم ونسق مدرسہ کو مدنظر رکھ کر اس کام کو انجام دے سکتے ہیں جو کہ خود طلبہ کو منتق ضابطہ اور بڑی سی بڑی مشکل میں باہمت اور مستقل مزاج رہنے کا عادی بناتی ہے۔ شرافت کی عزت کرنا۔ ایثار نفسی کے لئے آمادہ رہنا اور نیکی اور سچائی کی انتہائی کوشش کرنا ان خوبیوں کو وہ سکھلا سکتے ہیں۔ وہ ان میں فرائض شناسی کا احساس پیدا کر سکتے ہیں اور ان کو یہ بات دل نشین کرا سکتے ہیں کہ دوسروں کی توقیر وعزت بشرطیکہ وہ سب منصفانہ طریقے سے کیجائے مدرسہ کی متفقہ زندگی میں بالخصوص کھیل کے میدان پر اُن کو ایمانداری سے کھیلنے کا عادی

بتانا چاہئے۔ اور ایک دوسرے سے وفاشعارانہ سلوک کی تعلیم دینی چاہیئے کیونکہ یہی دونوں خوبیاں اُن کو آیندہ زندگی میں یہ سکھلائے گی کہ عزت کیا شئے ہے۔

ان تمام کوششوں میں طلبہ کی بہبودی کے مدنظر اساتذہ والدین کو اپنا شریک بنائیں تاکہ متفقہ کوشش سے نہ صرف طلبا کامل طور پر نشو ونما پاسکیں بلکہ اس قوم کے لئے جس سے ان کا تعلق ہے مفید رکن ثابت ہوں۔ اور اس ملک کے لئے ہونہار ثابت ہوں جہاں پر وہ پیدا ہوئے ہیں۔

تبصرے

ابراہیمیہ کارخانہ صحافی۔ حیدرآباد۔ اس کارخانہ سے ہمیں ایک مختصر رپورٹ اور کیالنڈر وصول ہوا ہے۔ کیالنڈر خوبصورت ہے۔ رپورٹ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کارخانہ مذکور اپنی عمر کے ابتدائی مدارج کامیابی سے طے کر رہا ہے۔ سید ابراہیم علی صاحب منتظم کارخانہ سے اُمید ہے کہ وہ سچے، عمدہ اور عمدہ کام سے جلد اپنی ساکھ قایم کرلیں گے۔ ان کو چاہیئے کہ اپنے نرخ کی ایک فہرست مرتب کرکے شائع کردیں تاکہ اضلاع سے جلدبندی کے آرڈر آنے لگیں۔

رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور۔ اس قدیم رسالہ کے دورجدید کا دوسرا نمبر بابت ماہ فروری سنہ رواں ہمارے سامنے ہے۔ اُردو تعلیمی رسالوں میں یہ رسالہ پختہ عمر کو پہنچ چکا ہے اور ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ اس کی حالت زمانہ کے ساتھ بدلتی اور رو بترقی رہتی ہے۔ گو یہ تعلیمی رسالہ ہے لیکن اس کی فہرست مضامین پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف مدرسین بلکہ ان تمام اشخاص کے لئے مفید ہے جو پیشہ مدرسی کے دائرہ سے باہر ہونے کے باوجود تعلیمی اُمور سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اس میں

بچوں کی دلچسپی کا بھی سامان ہے اور آخر میں گلدستہ اطفال یعنی بچوں کا اخبار بھی دکھلائی دیتا ہے۔ اسکا حجم معہ اشتہارات جو خاص تعداد میں ہیں تقریباً پونے دو سو صفحات ہے۔ اس کے باوجود اس کی سالانہ قیمت صرف (للعہ) ہے۔ ہمارے خیال میں اس رسالہ سے کوئی مدرسہ و کتب خانہ خالی نہ رہنا چاہیئے۔

ہُنر مند لاہور۔ صوبہ پنجاب رسالوں اور اخباروں کی کان ہے۔ غالباً اس کی وجہ صرف عوام کا عمدہ مذاق نہیں ہے بلکہ مطابع کی اچھی حالت کو اس میں بہت کچھ دخل ہے۔ ہم کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ ایسے زمانہ میں جب کہ صنعت و حرفت کا خیال عام ہوتا جاتا ہے پنجاب نے پیش قدمی کی اور ہُنر مند رسالہ جاری کر کے نہ صرف ایک کمی کو پورا کیا بلکہ ملک کی خدمت کرنی شروع کردی اس کے سالگرہ نمبر کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قابل ایڈیٹران صاحبان نظری مضامین کو پس پشت رکھکر ایسے عملی مضامین شائع کرتے ہیں جو کم سرمایہ اشخاص کے لئے کار آمد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً تجارت کے زرین اصول و فن اشتہارات یہ مضامین میں تو زیادہ مضامین عملی پہلو لئے ہوئے ہیں جیسے بچوں کے بوٹ بنانے کا سہل طریقہ۔ بورڈ ورک وغیرہ۔ ہم قابل ایڈیٹران صاحبان سے یہ ضرور عرض کرینگے کہ ان کے رسالہ کی کامیابی کے لئے عمدہ تصاویر و اشکال کی سخت ضرورت ہے اور یہ پتھر کے چھاپہ سے ممکن نہیں ان کی کوشش ہونی چاہیئے کہ سائنٹیفک امریکن یا میکانک کا پہلو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ حجم ۴۸ صفحات۔ کاغذ لکھائی معمولی قیمت سالانہ صرف (سے) روپیہ نمونہ کا پرچہ ۸ر

انعقاد جلسہ تحتانیہ مدرسہ قصبہ و تعلقہ اندول

۱۰ فروردی ۱۳۳۸ ف بروز جمعہ منجانب اساتذہ مدرسہ ہذا جناب مولوی عبد الرحمن خان صاحب صدر مدرس مدرسہ اندول و متبدلہ ماڈل اسکول قصبہ ٹپن چرو کا وداعی جلسہ زیر صدارت جناب مولوی محمد محی الدین علی صاحب بشرکت جمیع اہالیان قصبہ اندول و جملہ اسٹاف مدارس جوگی پیٹھ و ڈاکور و بعض مقامی وکلا اور جناب مولوی میر شہسوار علی صاحب صدر مدرس حال ۲ بجے سے ۴½ بجے شام تک ہوا۔

بعد ہار پوشی جناب مولوی سالم علی صاحب مددگار مدرس نے قرأت کی اور لطیف الدین و نذیر احمد طلبا نے حمد خوانی کی۔ بعد سید عبد القادر و فصیح الدین و شرف الدین طالب علموں نے جناب صدر مدرس صاحب کی ہمدردی و محبت کا ذکر کیا۔ اور ظہیر الدین طالب علم نے جناب ممدوح کی توصیفی و وداعی نظم سنائی۔ مولوی محمد منیر الدین صاحب مددگار مدرس نے مصلحتاً بہترین طریقہ سے علم کے فوائد بیان کر کے حاضرین کے معلومات میں اضافہ فرمایا بعد ازاں شیخ مدار مددگار مدرس نے صاحب موصوف کے نایاب امور و بہترین کارگزاریوں کا تفصیلی اظہار کرتے ہوئے نہایت مؤثر طریقہ سے رپورٹ پڑھی۔ فصیح الدین و سید عبد القادر طالب علموں نے دعائے نظم متعلقہ (شاہ دکن) پڑھ کر اہل مجلس کو خوش کیا اس کے بعد مولوی محمد عبد الرحمن خان صاحب صدر مدرس نے اپنے خیالات و جذبات کا اظہار فرما کر محفل کے آنسو بہاتے ہوئے طلبا و اساتذہ و احباب کا شکریہ ادا کیا۔ جناب صدر نشین صاحب نے صدر مدرس صاحب موصوف کی ہمدردی و ملنساری و حمیدہ اخلاق کا تذکرہ نہایت وضاحت اور خوبی سے بیان فرمایا آخیر تقریر میں سرخی (والدین کو اپنے اولاد کی تربیت کس اصول پر کرنی چاہیئے) کے متعلق وضاحت کے ساتھ اپنے بہترین معلومات و خیالات کا اظہار فرمایا بعد ازاں

مولوی محمد منیر الدین صاحب حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اختتام جلسہ پر تقسیم شیرنی و چائے نوشی اور خاص خاص احباب بعد تناول طعام جو مدرسین مدرسہ ہذا کی جانب سے ترتیب دیا گیا تھا جلسہ ختم ہوا۔ مرقوم ۱۵ماہ فروردی ۱۳۳۸ف

جلسۂ تعلیمی مدرسۂ تحتانیہ درجہ اول قصبہ جیور گی تعلقہ اندولہ ضلع گلبرگہ شریف

بتاریخ ۹ ماہ فروردی ۱۳۳۸ف روز یکشنبہ مدرسہ تحتانیہ درجہ اول قصبہ جیور گی تعلقہ اندولہ ضلع گلبرگہ شریف کا تعلیمی جلسہ بصدارت جناب مولوی محمد عمر خاں صاحب رضوی تحصیلدار تعلقہ ہذا منعقد ہوا تھا جس میں مقامی عہدہ داران و ملازمین سرکار و معززین قصبہ اطراف و جوانب کے علم دوست اشخاص شریک تھے۔ مدرسہ خوشنما رنگین قطعات اور رنگ برنگ کے جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا جلسہ کا آغاز قرأت سے کیا گیا۔ طلبہ مدرسہ نے حمد و نعت شریف نہایت خوش الحانی سے پڑھی۔ مسٹر بھیم راؤ صاحب صیغہ دار نے کنڑی زبان میں علمی فوائد کو بخوبی واضح کیا۔ مولوی شیخ داؤد صاحب نے علم پر تقریریں کیں۔ بہ مسرت نام اسکیل مدرسین مدرسہ نے اپنے ذاتی سرمایہ سے کتب و تختیاں و دیگر سامان نوشت و خواند غریب و نادار طلبہ کو تقسیم کرنے کی غرض سے منگوایا تھا جس کو صدر نشین صاحب نے اپنے دست مبارک سے تقسیم فرمایا۔ اس کے بعد مولوی محمد ابراہیم صاحب صدر مدرس نے خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے حاضرین اور صدر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ بالآخر حضرت اقدس و اعلیٰ و شہزادگان بلند اقبال کی ترقی عمر و اقبال کیلئے دعا مانگی گئی۔ پھول و پان سے حاضرین کی تواضع کی گئی جلسہ برخاست ہوا۔

جلوس طلبہ ٹھیک ۵ بجے مدرسہ سے نکلا جلوس کے آگے (۲۲) لڑکے تقریباً ہم قد و ہم عمر باڈریس ہاتھوں میں رنگین جھنڈیاں لے کر نظم سلامتی بادشاہ پڑھتے ہوئے قدم بہ قدم بڑھتے تھے جس سے جلوس کی شان دوبالا معلوم ہوتی تھی۔ غرض جلوس حضرت اخوند میر رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ شریف پہنچا شب میں ایک سبق آموز اخلاقی ڈرامہ ہوا جو دیکھنے سے

تعلق رکھتا تھا دوسرے روز مدرسین مدرسہ کی جانب سے ملازمین سرکار و مقامی عہدہ داران و معززین قصبہ کی ضیافت کی گئی تھی۔ اہل ہنود برہمنوں کے خورد و نوش کا انتظام نرشہیوں دیول میں کیا گیا تھا۔ اور مسلمانوں کا امین باغ میں جو تقریباً آبادی سے ایک فرلانگ پر واقع ہے۔ غرض خورد و نوش کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر تھا۔ مدرسہ کے بچوں سمیت (۳۰۰) آدمی کے قریب اس ضیافت میں شریک تھے۔ جب دعوتی لوگ کھانے سے فارغ ہوئے فٹبال گراونڈ میں جمع ہوئے۔ مدرسہ کے بچوں کا اسپورٹس رہا۔ اور مختلف قسم کے کھیل ہوئے جس میں جناب صدر مدرس صاحب نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامات تقسیم کئے۔ طلبہ جوش مسرت میں نعرہائے طرب بلند کرتے تھے الحمدللہ ٹھیک ۶ بجے جلسہ اسپورٹس ختم ہوا۔

بتاریخ ۱۰ رمضان المبارک ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۷ فروردی ۱۳۳۸ف روز دوشنبہ تخت نشینی اعلیٰ حضرت قدر قدرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہٗ کی تقریب میں ماڈل اسکول قصبہ پلارتی تعلقہ میدک میں ایک جلسہ بسرپرستی جناب سرکل انسپکٹر صاحب پولیس حلقہ میدک منایا گیا۔ طلبا مدرسہ نے دعائیہ نظمیں پڑھیں۔ اور صدر مدرس صاحب نے اعلیٰحضرت بندگان عالی کی اس اٹھارہ سالہ کارفرمائی کا ذکر کرتے ہوئے دعا سلامتی اعلیٰحضرت بندگانعالی و شہزادگان بلند اقبال و شہزادیاں ہمایوں فال کے بعد اپنی تقریر ختم کی۔ جلسہ برخاست ہوا

مدرسہ تحتانیہ درجہ اول چنڈرکی ضلع گلبرگہ شریف کا سالانہ جلسہ کامیابی کے ساتھ مولوی سید حسین صاحب معلم صدر مہتمم تعلیمات صوبہ گلبرگہ شریف کی صدارت میں مولوی معین الدین صاحب مہتمم تعلیمات ضلع کی موجودگی میں ہوا۔ تعداد حاضرین جلسہ

تقریباً چار سو تھی۔ جلسہ کا آغاز قرأت اور نظموں سے ہوا۔ صدر مدرس صاحب نے رپورٹ مدرسہ سُنائی۔ صدر صاحب جلسہ و مولوی معین الدین صاحب نے مؤثر تقریریں کیں۔ جلسہ کے اختتام پر اعلیٰحضرت بندگان عالی کی عمر و ترقی اقبال کے لئے دُعا مانگی گئی۔ اس سلسلہ میں مدرسہ مذکور کے نام سے سفری کتب خانہ کا ایک صندوق قیمتی (للعہ) منظور کیا گیا ہے۔

اب تک علمائے حیاتیات (Biology) یہ نہیں جانتے تھے کہ جسم انسانی میں وہ کونسا عضو ہے جس پر زندگی کا انحصار ہے اب روسی اور جرمن ڈاکٹروں کی تحقیقات سے یہ امر ثابت ہوگیا ہے۔ کہ بدن میں کان کی شکل کے دو ٹکڑے ہیں جو بچے کی مٹھی برابر ہیں۔ اِن کے اندر غدود ہیں اگر ان غدود کا عرق لے کر ایسے دل پر ڈالا جائے جس کی حرکت بند ہو چکی ہو تو وہ فوراً حرکت کرنے لگتا ہے۔

ترکی خزانہ سلاطین آل عثمان کے جواہرات کا خزانہ مصطفےٰ کمال پاشاہ نے فروخت کرنے کے لئے ماہرین کے سامنے پیش کیا ہے کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا اور محیر العقول جواہر خانہ ہے اور اس کی مالیت کروڑوں پونڈ کی ہے۔ یہ تمام دولت ترکی میں اشاعت تعلیم کے لئے خرچ کی جائے گی۔

موٹر کار بوٹ پلین نے ایک ایسی موٹر ایجاد کرکے گذشتہ نمائش میں پیش کی تھی جو سڑک پر پہیوں سے عام موٹروں کی طرح چلتی ہے۔ اگر آگے لایا جائے تو کشتی کی طرح تیرتی ہے اور اگر اس کا چلانے والا چاہے تو ہوائی جہاز کی طرح ہوا میں اُڑ سکتی ہے غالباً دنیا کی آئندہ مقبول سواری یہی ہوگی۔

قواعد

(۱) یہ محض تعلیمی رسالہ ہے جس میں تعلیم کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے سیاسی مضامین شریک نہ کئے جائیں گے۔

(۲) یہ رسالہ ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوگا۔

(۳) پرچہ وصول نہ ہو تو ہر ماہ فصلی کی ۲۵ تاریخ تک خریدار صاحبان بحوالہ نمبر خریداری مطلع فرمائیں۔

(۴) جو مضامین ناقابل طبع متصور ہوں گے اُن کی واپسی خرچہ ڈاک کی روانگی پر منحصر ہوگی۔

(۵) اس رسالہ کی قیمت سالانہ (ے) مع محصول ڈاک ہے جو پیشگی لی جائے گی۔

(۶) نمونہ کا پرچہ چھ آنے کے ٹکٹ وصول ہونے پر ارسال کیا جائے گا۔

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ وصول ہونا چاہئے ورنہ ادائی جواب میں مجبوری رہے گی۔

(۸) اجرت طبع اشتہارات درج ذیل ہے۔ رقم وصول ہونے پر اشتہارات طبع کئے جائیں گے۔

تعداد و مدت	صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
ایک بار	عہ	صہ ۸ر	ے ۸ر
سہ بار	ععہ ۸ر	للوعہ	عہ ۸ر
ششماہ	للعہ	ععہ ۸ر	صعہ
سالانہ	صعہ	للعہ	ععہ ۸ر

(۹) جملہ مراسلت و ترسیل رقوم منی آرڈر وغیرہ پتہ ذیل پر ہونی چاہئے۔

دفتر رسالہ المعلم سیف آباد حیدرآباد دکن

AL MUALLIM

سنہ ۱۹۱۹ء میں چار نئے ٹریننگ مدارس کا افتتاح عمل میں آیا جن میں سے تین عورتوں کے لئے (ایک حیدرآباد میں، دوسرا ورنگل اور تیسرا اورنگ آباد میں) اور ایک مردوں کے لئے ورنگل میں)......... اس کے ایک سال بعد عورتوں کے لئے ایک ٹریننگ مدرسہ گلبرگہ میں اور دوسرا مردوں کے لئے اورنگ آباد میں قایم کیا گیا۔ ورنگل اورنگ آباد اور گلبرگہ کے ٹریننگ مدارس کا مقصد یہ تھا کہ ہر صوبہ کی ملکی زبان میں تعلیم ہو حیدرآباد کے ٹریننگ مدرسہ میں اردو تحتانیہ مدارس نسوان کی معلمات ٹریننگ حاصل کرتی رہیں۔

ثانوی مدارس کے اساتذہ کے لئے سنہ ۱۹۲۴ء میں پہلی مرتبہ ٹریننگ کا انتظام کیا گیا اور ہر سال شہر حیدرآباد میں (۲۵) میٹرک کامیاب اور (۱۰۰) مڈل پاس اساتذہ کی ٹریننگ ہونے لگی اس کے دو سال کے بعد ہی انٹرمیڈیٹ کامیاب اساتذہ کے لئے ایک سالہ ٹریننگ کورس کی کلاس کا افتتاح عمل میں آیا۔ اسی وقت مضامین میں کمی کی جاکر مڈل کامیاب اور میٹرک کامیاب۔ اساتذہ کی مدت زیر تعلیم جو علی الترتیب ½ ۱ سال و ۲ دو سال تھی ایک سال کردی گئی۔ جامعہ عثمانیہ میں شعبہ تعلیم کے قیام کی وجہ سے سنہ ۱۹۲۹ء میں طیلسانوں کے لئے ٹریننگ کی ایک کلاس کھولی گئی اور اس تبدیلی کے بعد یہ درس گاہ عثمانیہ ٹریننگ کالج کہلائی جانے لگی سنہ ۱۹۳۱ء میں ٹریننگ کالج سے اردو مڈل کامیاب اساتذہ کی ٹریننگ کلاس برخواست کردی گئی اور ایسے اساتذہ کے لئے اورنگ آباد ٹریننگ مدرسہ میں مرہٹی، ورنگل ٹریننگ مدرسہ میں تلنگی اور گلبرگہ ٹریننگ مدرسہ میں کنڑی زبان میں انتظامات کیے گئے۔ اورنگ آباد اور ورنگل کے ٹریننگ مدارس میں میٹرک کامیاب اساتذہ کی ٹریننگ کی جماعتیں سنہ ۱۹۳۲ء میں کھولی گئیں۔

ویسلین مشین (Wesleyan Mission) کے دو مسلمہ نارمل مدارس (ایک میدک میں معلمین کے لئے اور دوسرا سکندرآباد میں معلمات کے لئے) کو شامل کیا جائے تو سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء میں مختلف گریڈ کی ۹ ٹریننگ کی درس گاہیں تھیں جن میں تعداد طلبہ و طالبات

(۲۸۱) تھی ۔

عملہ نگرانی

۱۹۱۲ء–۱۳ء میں ہائی اسکولس کے لئے ایک چیف انسپکٹر کا تقرر کیا گیا اور ۱۹۱۳ء–۱۴ء میں مدارس نسوان کے لئے ایک صدر مہتممہ کا تقرر کیا گیا تھا۔
۱۹۱۳ء–۱۴ء میں حسب مشورہ مسٹر میہو ہر ضلع کے لئے ایک انسپکٹر کے تقرر کی اسکیم منظور کی گئی۔ لیکن ۱۹۱۷ء–۱۸ء تک مکمل طور پر اسکیم کا نفاذ نہ ہوسکا۔ اسکیم میں ہر ضلع میں فی (۶۶) تحتانیہ مدارس کے اضافہ پر ایک زاید ناظر یا سب اسسٹنٹ انسپکٹر کے تقرر کی گنجایش رکھی گئی۔
۱۹۱۸ء–۱۹ء میں عملہ نگرانی کی دوبارہ مکمل تنظیم کی گئی نظم و نسق میں مرکزیت قائم کرنے کے لئے ہر صوبہ کے لئے ایک صدر مہتمم کا تقرر کیا گیا اور بلدہ حیدرآباد کے انسپکٹر کو بھی صدر مہتمم کا درجہ عطا کیا گیا۔ اپنے تحت کے مہتمموں کے کام کی نگرانی کے علاوہ ہر صدر مہتمم کا یہ بھی فرض تھا کہ اپنی سمت میں ثانوی تعلیم کی تنظیم و ارتقاء کی بھی کوشش کرے۔ صدر مہتمی کی نئی خدمات کے قیام کی وجہ سے چیف انسپکٹر آف ہائی اسکولس کی خدمت غیر ضروری تھی اس لئے ۱۹۲۰ء میں یہ خدمت برخواست کردی گئی اور اس کی بجائے نائب ناظم تعلیمات کی خدمت وجود میں لائی گئی۔

اختتام

ہز اگزالٹیڈ ہائینس نواب سر میر عثمان علیخاں بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی پچیس سالہ حکومت کا دور علوم و فنون کی ترقی کا دور ہے۔ حضور پرنور نے شروع ہی سے ریاست حیدرآباد کو زمانہ حال کی ترقی یافتہ ریاست بنانے کا عزم فرمالیا تھا۔ اسی مقصد کو مد نظر رکھ کر انہوں نے ریاست میں تعلیم کی اشاعت اور ترقی کے لئے خاص توجہ مبذول فرمائی۔ حضور پرنور کی تعلیم میں گہری دلچسپی ہی کا نتیجہ تھا کہ تخت نشینی کے چھ سال کے اندر ہی اندر جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا جو ریاست کی تاریخ تعلیم میں بہت ہی زرین کارنامہ ہے۔ تعلیمی پالیسی کی مستشرقیت نے رفتار ترقی کو بہت ہی تیز کردیا اور دائرہ علم و فن کو وسیع تر بنادیا جو غیر زبان کا ذریعہ تعلیم اختیار کرنے سے ناممکن تھی۔ حضور والا کی روایتی سخاوت اور ریاست کی مالی خوشحالی کی وجہ سے تعلیمات کا موازنہ جو ۱۹۱۰ء–۱۱ء میں صرف چودہ لاکھ تھا ۱۹۳۴ء–۳۵ء میں بڑھ کر ایک کروڑ سے زاید ہوگیا۔ درسگاہوں

اور طلبہ کی تعداد میں اضافہ جو اس عرصہ میں ہوا حسب ذیل تھا۔

سنین	درس گاہیں	طلبہ
۱۹۱۰-۱۱ء	۱۰۳۶	۶۶۴۸۲
۱۹۳۳-۳۴ء	۴۷۴۶	۲۵۳۵۸۲

تحت بالا سے ظاہر ہوگا کہ بمقابلہ ۱۹۱۱ء تعداد درس گاہ اور طلبہ میں تقریباً پانچ گنی ترقی ہوگئی۔

زیر تعلیم طلبہ کا مدرسہ جانے والی عمر کے لڑکوں کی کل آبادی سے تناسب اس وقت (۵) فی صدی سے بھی کم تھا لیکن اب یہ تناسب (۱۸) فی صدی ہے مدرسہ جانے والی عمر کے لڑکوں کی آبادی کا تناسب (۳۰) فی صدی ہے جو ۱۹۱۱ء میں ۹.۵ فیصد تھا۔ آبادی اناث کی مدرسہ جانے والی لڑکیوں کا تناسب اس وقت (۵) فی صدی ہے جو ۱۹۱۱ء میں صرف ۱.۰ تھا۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جس طرح ریاست کی تعلیمی تنظیم کی رپورٹ دور جدید کے ابتدائی حصہ کی امتیازی خصوصیت کو بتلاتی ہے بالکل اسی طرح دوسری رپورٹ جس کا ذکر ابھی کیا گیا تنظیم زمانہ جدید کی ترقیوں کا لحاظ کرتے ہوئے بتلائی گئی ہے اس دور کے آخری حصہ کی نمایاں خصوصیت ہے جس کے بعد سے ریاست کی تاریخ تعلیم کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ برطانوی ہند میں ماہرین تعلیم پیشہ ورانہ تعلیم کو جاری کرنے اور نظام تعلیم کی دوبارہ تنظیم کرنے کے معاملات میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں [illegible] سرکار عالی کی گورنمنٹ بھی [illegible] سے اسی مسئلہ پر انتہائی غور و خوص فرما رہی ہے چنانچہ ۱۹۲۵ء میں اس مسئلہ کے غور و خوض کے لئے ایک کمیٹی منعقد کی گئی تھی اور اسی سال رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نے اپنے ہدایت آمیز عالمانہ اور روشن خطبہ تقسیم اسناد جامعہ پنجاب میں نظام تعلیم کی دوبارہ تنظیم ہی پر صرف زور نہ دیا بلکہ وہ طریقے بھی بتلائے جن کے ذریعہ اصلاح ممکن ہے۔ سر اکبر حیدری کے پیش کردہ خاص

خاص اصول کو پنجاب انکوائری کمیٹی اور بعد ازاں مارچ سنہ ۱۹۳۴ء میں آل انڈیا یونیورسٹیز کانفرنس نے منظور کر لئے۔ اصول یہ تھے:-

۱۔ تحتانی تعلیم کا مقصد عام لوگوں کو تعلیم یافتہ ہی بنانا نہ ہو بلکہ ان کی آیندہ زندگی کو بھی مفید اور بہتر بنانا مقصود ہو۔

۲۔ تعلیم کی ہر منزل خود مکتفی ہو جس کا کوئی خاص معین مقصد ہو۔

۳۔ جامعاتی تعلیم سے قبل بالکلیہ ادبی تعلیم کی بجائے پیشہ ورانہ تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

سنہ ۱۹۲۵ء کی منعقدہ کمیٹی کے سفارشات کے نتیجہ کے طور پر پیشہ ورانہ تعلیم اکثر مدارس میں سنہ ۱۹۲۸ء اور سنہ ۱۹۳۳ء کے درمیان جاری کی گئی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ عام تعلیم کا موجودہ نصاب بھی برقرار رکھا گیا۔ نومبر سنہ ۱۹۳۴ء میں انجمن اساتذہ کی آٹھویں سالانہ کانفرنس کے خطبہ صدارت میں ڈاکٹر۔ اے۔ ایچ۔ میکنزی آنجہانی نے جو اس وقت جامعہ عثمانیہ کے نائب امیر تھے۔ ریاست کے نظام تعلیم میں بڑی تبدیلی کی ضرورت کی طرف توجہ منعطف کرائی وہ اسکیم جس کا انہوں نے اپنے خطبہ میں خاکہ پیش کیا تھا وہ بالکل اس اسکیم کے مطابق تھی جس کو حکومت صوبہ جات متحدہ نے ترتیب دی تھی۔ اس اسکیم میں ان خاص اصولوں کا بھی ذکر تھا جن کو رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نے جامعہ پنجاب کے خطبہ تقسیم اسناد میں بیان کیا تھا حکومت سرکار عالی نے فوری دوبارہ تنظیم کے مسئلہ کے سوچ بچار کے لئے ایک کمیٹی مقرر فرمائی۔ مولوی خان فضل محمد خاں صاحب اور ڈاکٹر میکنزی آنجہانی کمیٹی کے دو ارکان کی ذیلی کمیٹی بنائی گئی اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء میں حکومت نے ان کی سفارشات کو چند ترمیمات کے بعد منظور فرمالیا۔

نئی اسکیم کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

۱۔ تعلیم کی چار منزلیں ہونی چاہئیں جن میں ہر ایک کا ایک خاص مقصد ہو۔ تحتانی (۵ سال)۔ ثانوی (۴ سال)۔ فوقانوی (۳ سال)۔ جامعاتی (۳ سال)۔

۲۔ ثانوی منزل میں پیشہ ورانہ تعلیم کا ہی انتظام نہ ہو بلکہ فوقانوی تعلیم کی بنیاد کا بھی معقول انتظام ہو فوقانوی تعلیم میں فنون و سائینس کے مضامین کے علاوہ زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کا بھی انتظام ہو۔

۳۔ ذریعۂ تعلیم کے متعلق حکومت کی موجودہ پالیسی میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہ کیا جائے۔

۴۔ ثانوی اور فوقانوی تعلیم کی نگرانی اور انتظام کے لئے تعلیمات کا ایک بورڈ بنایا جائے جس کے صدر ناظم تعلیمات ہوں اس مجلس میں محکمۂ تعلیمات، جامعۂ عثمانیہ، پبلک، تعلیم نسوان کے نمائندوں کے ساتھ ساتھ زراعت، تجارت وصنعت و حرفت، امداد باہمی اور تعمیرات عامہ کے محکموں کی نمائندگی بھی ہو۔

۵۔ دو امتحانات ہونے چاہئیں پہلا ثانوی منزل کے اختتام پر اور دوسرا فوقانوی منزل کے اختتام پر۔

موجودہ نظام تعلیم کی اصل خامی یہ ہے کہ جامعاتی تعلیم کی ضروریات کی خاطر فوقانوی تعلیم کے نصاب میں یکسانیت پیدا کی گئی ہے۔ سرکار عالی نے جو اسکیم حال ہی میں منظور فرمائی ہے اس کی رو سے نصاب تعلیم میں بہت کچھ لوچ پیدا ہو جائے گا۔ طلبہ کے لئے اکاڈمیک میلان کے ساتھ ساتھ مختلف نصابات تعلیم مقرر کئے جائیں گے اور ان طلبہ کے لئے جو پیشہ ورانہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں یا فوقانوی تعلیم کے ختم کرنے کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھنے کی صورت میں ایک علیٰحدہ نصاب ترتیب دیا جائے گا۔ اسی کے ساتھ ساتھ دیہی رقبوں میں تحتانی اور ثانوی مدارس کی تعلیم کے نصاب دیہی زندگی کے ماحول کے مطابق بنائے جائیں گے۔ جامعہ میں داخلہ کے لئے اس اسکیم نے معیار کو بہت کچھ بلند کر دیا ہے جس کی شدید ضرورت ہے۔ اس نئی اسکیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تعلیم کا تعلق روزگار سے کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے محکمہ جات زراعت اور تجارت وصنعت و حرفت کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ تیزی سے تعاون کریں اور ایسے نوجوانوں کے لئے جو نئی اسکیم کے مطابق زراعتی، تجارتی

اور صنعتی تعلیم حاصل کریں گے، روزگار کی نئی راہیں ان کے لئے کھول دیں۔
نظام کالج کے متعلق حکومت نے ذیلی کمیٹی کی رپورٹ کو منظور فرماتے ہوئے یہ تحفظ رکھا کہ
نظام کالج کا الحاق ابھی کچھ عرصہ کے لئے جامعہ مدارس سے رکھا جائے۔ یہ الفاظ یہ تبلاتے ہیں
کہ حکومت ذیلی کمیٹی کے سفارشات پر پھر یہ غور کرنا چاہتی ہے کہ "نظام کالج جامعہ عثمانیہ کا ایک
ملحقہ کالج ہو اور جس میں جامعہ عثمانیہ کی ڈگریاں دی جائیں مگر ذریعہ تعلیم انگریزی ہی رہے"
ذیلی کمیٹی کی تیار کردہ رپورٹ کے صفحہ ۲ فقرہ ۸۴ ج میں اس سفارش کے وجوہات درج
ہیں۔ رپورٹ مظہر ہے کہ "ہمارے گواہ عملی طور پر اس بات پر متفق ہیں کہ سرکار عالی کی ریاست میں
جامعہ مدارس کا اقتدار ختم کر دیا جائے ہم بھی ذاتی طور پر اس رائے سے اتفاق رکھتے ہیں۔
ہر ریاست کا تعلیمی نظام اور نصاب وہاں کے باشندوں کی ضروریات اور حالات کا لحاظ کرتے
ہوئے تیار کیا جانا ضروری ہے یہ امر تعلیمی نکتہ نگاہ سے بہت ہی غیر اطمینان بخش ہے کہ ایک ایسی
جماعت جو ریاست کے صدر مقام سے ۵۰۰ میل دور ہو ریاست کے تعلیمی نظام پر کسی قسم کا بھی اقتدار
رکھے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ سرکار عالی کی حکومت اپنے نظام تعلیم اور تعلیمی نشوونما کے متعلق کسی قسم کا
نظریہ اس وقت تک ظاہر نہیں کر سکتی جب تک کہ اس نظام کا کچھ بھی حصہ ان کے اختیار سے
باہر ہو۔
اس اسکیم کے نفاذ کے قبل بہت کچھ ابتدائی کام انجام دینا ہوگا اور اس کام کی تکمیل پر بھی
پیشہ ورانہ اور فنی تعلیم کے نصاب کا نفاذ تبدریج موازنہ کی گنجایش اور ریاست کے معاشی
ضروریات کے لحاظ سے کیا جائے گا۔ جب اسکیم مادی صورت اختیار کر لیگی تو حیدرآباد اس پر
بجا ناز کر سکے گا کہ اس نے پورے ہندوستان کی رہبری کی ہے اور تعلیم کو زمانہ جدید کی
ضروریات کے مطابق بنایا ہے اس قسم کی رہبری کرنے کا فخر اس ریاست کو اس کے قبل
مادری زبان کو ذریعہ تعلیم کے اختیار کرنے میں رہا ہے۔
ہم خوش قسمت ہیں کہ تعلیمات کے صدر المہام عالی جناب نواب مہدی یار جنگ بہادر ہیں

جن کو تعلیمی تنظیم و نظم و نسق کا برطانوی ہند اور اس ریاست میں عملی تجربہ حاصل رہا ہے اور جو ریاست کی تعلیمی ضروریات کا گہرا مطالعہ فرما چکے ہیں۔ تعلیمی تنظیم کے علاوہ تحتانی اور نسوانی تعلیم کے مسائل صاحب موصوف کی گہری توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ انجمن اساتذہ بلدہ حیدرآباد کی دسویں سالانہ کانفرنس میں صاحب موصوف نے ایک تقریر فرمائی تھی جس میں یہ بتلایا تھا کہ حکومت کا یہ ارادہ ہے کہ تحتانی تعلیم کو وسعت دینے کے لئے موثر ذرائع اختیار کئے جائیں۔ جبری تعلیم کی تحریک کے ساتھ صاحب موصوف کو بہت ہمدردی ہے لیکن عملی اور نظم و نسق کے مشکلات کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہو سکا کہ تحتانی تعلیم کو جلد از جلد لازم قرار دیا جائے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ سردست ایسے ہی لڑکوں کے لئے جو بخوشی مدرسہ جانا چاہتے ہیں بہت کچھ سہولتیں بہم پہونچائی ہیں۔ تنظیم تعلیم کی رپورٹ میں جس کو ذیلی کمیٹی نے تیار کیا ہے یہ لکھا ہوا ہے کہ "محکمہ تعلیمات کا مقصد یہ ہے کہ تحتانی تعلیم کو اس قدر وسعت دے کہ مدرسہ جانے والی عمر کے ہر لڑکے اور ہر لڑکی کے لئے تعلیمی سہولتیں بہم پہونچائی جائیں"۔

تحتانی تعلیم کے متعلق ہمارے دوراندیش اور خیرخواہ حکمران نے جشن سیمیں کے موقع پر وفادار رعایا کے پیش کردہ سپاس نامہ کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ "یہ میری دلی خواہش ہے کہ ابتدائی تعلیم عام ہو۔ ملک میں تحتانی مدارس زیادہ ہوں اور ان مدارس کے لئے موزوں عمارتیں مہیا کی جائیں اور لوکل فنڈ مجالس کے ذریعہ رعایا کو مواقع دئے جائیں کہ وہ ابتدائی تعلیم کو فروغ دینے کے مسئلہ میں دلچسپی لے"۔ اس ارشاد گرامی کے مدنظر ہم یہ توقع کرتے ہیں کہ مستقبل قریب میں موازنہ کی گنجایش کے لحاظ سے ابتدائی تعلیم کی اصلاح اور وسعت دینے کا لائحہ عمل ترتیب دیا جائے گا۔

تعلیم نسواں کا مسئلہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ مجلس تعلیم کے نظام میں عورتوں کی نمائندگی کی نہ صرف گنجایش ہی رکھی گئی ہے بلکہ تعلیم نسواں کی آئینی مجلس کے قیام کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ جب یہ کمیٹی جس میں صرف عورتیں ہی اراکین ہوں گی، قایم ہو جائے گی تو تعلیم نسواں کے فروغ میں

کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے گا۔ ہر رائل ہائینس پرنسس آف برار عورتوں کی فلاح وبہبود دی
میں گہری دلچسپی لیتی ہیں۔ یہ امر بھی تعلیم نسواں کے درخشاں مستقبل کا شگون نیک ہے۔
یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر انجمن ہائے اساتذہ کا ذکر نہ کیا جائے جن کا قیام گذشتہ
زمانہ میں مختلف صوبہ جات میں عمل میں آچکا ہے۔ حیدرآباد کی انجمن اساتذہ نے خصوصیت کے
ساتھ اساتذہ کی تعلیمی دلچسپی کو بڑھانے کے لئے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں
انجمن کی جانب سے مختلف کمیٹیوں کا قیام عمل میں آیا جنہوں نے ایک درجن سے زائد رپورٹیں
مختلف تدریسی مضامین اور تعلیمی معاملات کے متعلق تیار کیں علاوہ ازیں دی حیدرآباد ٹیچر
انجمن کا سہ ماہی رسالہ ہے جس کے ذریعہ تعلیمی اصلاحات کے حالیہ نظریات اور تدریس کے عملی
طریقوں سے اساتذہ کو واقف کرایا جاتا ہے اور ان کی توجہ کو حالیہ تعلیمی مسائل پر مرکوز کیا جاتا ہے۔
اس ریاست کو اعلیٰ حضرت حضور پرنور جیسے روشن خیال حکمران کی تعلیمی فروغ کے لئے
فیاضانہ سرپرستی حاصل ہے اور جو رہبری ہز اکسلنسی دی رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری صدر کونسل
اور عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر صدرالمہام تعلیمات کی جو ہندوستان کے ماہران
تعلیم کے صف اول میں ہیں حاصل ہے اس کے مدنظر اس ریاست کی تعلیم کے روشن مستقبل کی
پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔
خدا ہمارے اعلیٰ حضرت حضور پرنور کو عمر خضر عطا کرے اور اقبال وصحت کے ساتھ ہمیشہ
خوش وخرم رکھے تاکہ یہ عظیم الشان ریاست ان کے شاندار دور حکومت کے فوائد سے ہمیشہ
ہمیشہ مستفید ہوتی رہے۔ آمین۔

ریڈیو

(یعنی)

بے تار مراسلت

سائنس کی روز افزوں ترقی اور نئی نئی ایجادات کا ہماری زندگی کے تمام شعبوں پر عملی اثر بالکل واضح ہے۔ ان سب میں سب سے زیادہ عجیب اور مفید ایجاد بے تار مراسلت ہے، اکثر ایجادات ایسی ہیں کہ ان سے صرف متمول اشخاص ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں مگر اس ایجاد سے ہر امیر و غریب مستفید ہو سکتا ہے۔ اس ایجاد نے وقت اور فاصلے کے موانعات کو دور کر کے ساری دنیا کو سمٹ کر مختصر کر دیا ہے۔ دنیا کے ایک گوشے سے چند ہی لمحوں میں خبریں ساری انسانی برادری تک پہنچا دی جا سکتی ہیں۔ غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ آج تک کوئی ایجاد نہیں ہوئی جو اس قدر مفید، ہر دل عزیز اور متعجب کرنے والی ہو۔

واقعی کس قدر عجیب بات ہے کہ ہم اس ایجاد کے ذریعے تقریریں گانے اور خبریں اس قدر آسانی سے سن لیتے ہیں خواہ نشرگاہ ہم سے ہزارہا میل کے فاصلے پر ہو۔ اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ عام فہم طریقے سے اس عجیب و غریب ایجاد کے اصول کی تشریح کی جائے۔

طبیعات کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ حرکت سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بجز ایک خاص قسم کی حرکت کے جس کو اہتزاز یا ارتعاش کہتے ہیں آواز کی پیدائش ممکن نہیں۔ ستار یا فڈل سے آواز اس لئے آتی ہے کہ تنا ہوا تار حرکت کرتا ہے۔ طبلہ پر جب ضرب پڑتی ہے تو تنا ہوا چمڑہ متحرک ہوتا ہے۔ اسی طرح قدرت نے ہمارے حلق میں ایک ایسی باریک جھلی بنائی ہے جس کی حرکت سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہاں تک تو آواز کی پیدائش کا ذکر تھا اب دیکھنا ہے کہ کوئی آواز پیدا ہونے کے بعد ہماری سماعت پر کس طرح اثر پیدا کرتی ہے۔ ہم جانتے

ہیں کہ اگر ساکن پانی میں ایک پتھر پھینکا جائے تو وہ سطح سے ٹکرا کر اس میں لہریں یا موجیں پیدا کرتا ہے۔ اس عمل کو تموج کہتے ہیں اسی طرح جب کوئی چیز (خواہ تار ہو یا پتلی تختی ہو یا کوئی جھلّی) تیزی کے ساتھ حرکت کر رہی ہو تو اس کی حرکت کی وجہ سے ہوا میں موجیں پیدا ہوتی ہیں۔ ہوا کا یہ تموج بہت تیزی کے ساتھ چاروں طرف پھیلتا ہے اور جب یہ موجیں ہمارے کان کے پردے سے ٹکراتی ہیں تو کان کا پردہ بھی اسی طرح حرکت کرنے لگتا ہے (جیسا کہ مبداءِ آواز متحرک ہے)۔ اس سے ہمارا دماغ متاثر ہو کر سماعت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اس طرح ہمارا کان ایک پیام وصول کرنے والا (یا وصولی) آلہ ہے جس کا ایک اہم جزو اس کا پردہ ہے، اگر کسی کے کان کا پردہ پھٹ گیا ہو تو وہ سماعت سے محروم رہے گا کیونکہ اس کے وصولی آلے کا ایک اہم جزو مفقود ہے۔
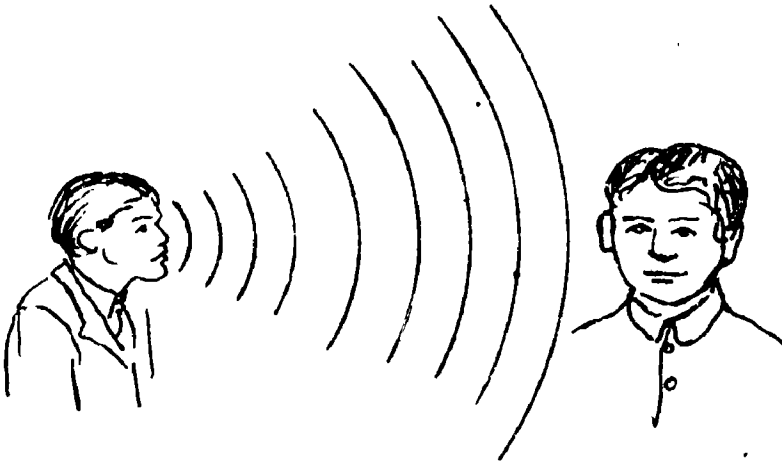
ہماری معمولی گفتگو میں آواز بالراست منتقل ہوتی ہے۔ گفتگو کرنے والے کے حلق سے نکلی ہوئی موجیں بالراست مخاطب کے کان تک پہنچتی ہیں۔ مگر آواز کی ایسی منتقلی بے تار مراسلت میں استعمال نہیں ہو سکتی۔ بالراست منتقلی صرف محدود فاصلوں کے لئے ہی ممکن ہے کیونکہ جیسے جیسے فاصلہ بڑھتا جاتا ہے آواز مدھم ہوتی جاتی ہے۔ نہایت بلند آواز بگل بھی مشکل سے دو میل کے فاصلے پر سنائی دیتا ہے تقریریں اور گانے چند گزوں سے زیادہ فاصلے پر سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اسی طرح سارے باجے اور موسیقی آلات محدود فاصلوں تک ہی سنائی دیتے ہیں۔

علاوہ ازیں اگر کئی آدمی ایک ساتھ گائیں یا تقریر کریں تو ان سب کی آوازیں خلط ملط ہو جاتی ہیں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ ہم جس کی آواز چاہیں سنیں اور باقی سب کی آواز بالکل سنائی نہ دے یعنی ہمارے کان انتخابی وصف نہیں رکھتے۔ اب غور کیجئے کہ ساری دنیا کی تمام نشرگاہوں سے جو گانے اور تقریریں نشر کی جاتی ہیں اگر ایک ساتھ سنائی دیں تو کس قدر بے لطفی پیدا ہو گی۔ پس ضرورت ہوئی کہ بجائے طریق راست کے کوئی اور طریقہ معلوم کیا جائے جس میں محدودیت نہ ہو اور انتخابی سہولت بھی پائی جائے سائنسی مفکرین کی تحقیق اور کوشش سے پتہ چلا کہ برقی توانائی کے استعمال سے ان دونوں دقتوں پر فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔

یہ معلوم کیا گیا کہ اگر متبادل برقی رو کسی تار میں دوڑائی جائے تو اس تار کے گرد برقی مقناطیسی موجیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ موجیں نہایت تیز رفتار ہوتی ہیں ان کی رفتار تقریباً دو لاکھ میل فی ثانیہ ہوتی ہے کیونکہ کرۂ ارض کے کسی دو مقامات کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ تیرہ ہزار میل ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ برقی مقناطیسی موجیں چشم زدن میں ساری دنیا کی سطح پر پھیل جاتی ہیں۔ ان موجوں کی دوسری اہم خاصیت یہ ہے کہ اگر ان کے راستے میں بلندی پر کوئی تنا ہوا تار ملے تو اس تار سے ٹکرا کر اس میں ایک برقی رو پیدا کر دیتے ہیں۔

ہر نشر گاہ پر ایک اونچا تنا ہوا تار دکھائی دیتا ہے یہ ترسیل ایریل کہلاتا ہے۔
اسی طرح ہر مکان پر جہاں وصولی آلہ ہو اسی قسم کا ایک تار بلندی پر تانا جاتا ہے اس کو وصولی ایریل کہتے ہیں۔

ہر نشر گاہ میں ایک کمرہ ہوتا ہے جہاں ایک میکروفون رکھا ہوتا ہے یہ ترسیلی کمرہ کہلاتا ہے۔
میکروفون کی خوبی یہ ہے کہ اگر وہ گانے والے یا مقرر کے سامنے رکھا جائے تو اس کی آواز کی موجوں سے متاثر ہو کر ایک برقی رو پیدا کرتا ہے۔ اس طرح پیدا شدہ برقی رو کو مرکزی برقی رو سے ملایا جاتا ہے اور ان دونوں کی مجموعی رو ترسیلی ایریل میں گذاری جاتی ہے۔ ایریل کے تار کے گرد برقی مقناطیسی موجیں پیدا ہو کر ہر طرف پھیلتی ہیں۔
یہ موجیں جب کسی موزوں وصولی ایریل سے ٹکراتی ہیں تو اس میں اُسی قسم کی برقی رو پیدا کرتی ہیں جس قسم کی رو ان کی پیدائش کا باعث ہوئی۔ وصولی آلے کو موزوں کرنے سے یہ رو پھر آواز کی شکل میں بدل جاتی ہے اور اب ہم وہی آواز سن سکتے ہیں جو نشر گاہ میں پیدا ہو رہی ہے۔

یہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جانا ضروری ہے کہ ہم صرف وہی گانے اور تقریریں سن سکتے ہیں جو اس مقام پر گائے جا رہے ہوں جہاں آواز کو برقی مقناطیسی موجوں میں تبدیل کرنے کا انتظام کیا گیا ہو۔ ایسے ہی مقام کو "نشر گاہ" کہتے ہیں۔ آپس کی مفاہمت سے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ ہر نشر گاہ مختلف تعدد (یعنی جدا گانہ قسم) کی رو کے ذریعہ پیام ارسال کرے۔ اس طرح مختلف نشر گاہوں کی آوازوں کے خلط ملط ہو جانے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ وصولی آلے کو موزوں کر کے جس نشر گاہ سے ہمنوا بنایا جائے گا صرف اسی نشر گاہ کی آوازیں سنائی دیں گی۔ باقی تمام نشر گاہوں سے نکلی ہوئی موجیں باوجود وصولی ایریل سے ٹکرانے کے بے اثر رہیں گی۔ مثلاً وصولی آلہ اگر ۱۲۹۰ کلو سیکلس کے لئے ترتیب دیا جائے تو صرف حیدر آباد کی نشر گاہ کا پیام وصول ہو سکے گا کیونکہ دنیا کی

اور کوئی نشرگاہ اس تعدد کی موجیں استعمال نہیں کرتا۔
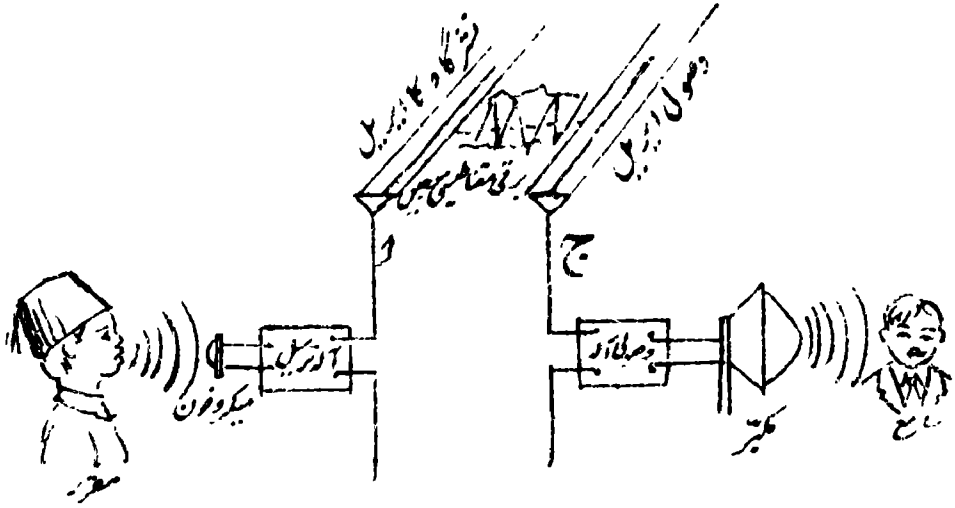
بائیں جانب مقرر نشرگاہ کے کرۂ ترسیل میں میکروفون کے سامنے کھڑا ہوا تقریر کر رہا ہے۔ اس کی آواز سے ہوا میں موجیں پیدا ہو رہی ہیں جو میکروفون سے ٹکراتی ہیں میکروفون آواز کی اس توانائی کو برقی توانائی میں بدل دیتا ہے۔ آلۂ ترسیل میں نشرگاہ کے مقررہ نقطہ کی برقی رو پیدا کرتی ہے میکروفون کی رو اس سے مل کر نشرگاہ کے ایریل میں دوراں ہوتی ہے۔ نشرگاہ کے ایریل سے برقی مقناطیسی موجیں چاروں طرف نہایت تیز رفتار کے ساتھ پھیلتی ہیں۔

سیدھی جانب نشرگاہ کا روانہ کیا ہوا پیام وصول کیا جا رہا ہے۔ برقی مقناطیسی موجیں وصولی ایریل سے ٹکراتی ہیں۔ وصولی آلہ اس نشرگاہ کے تعدد کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس لئے ان موجوں کے ٹکرانے سے جو برقی رو پیدا ہوتی ہے وہ وصولی آلہ میں پہنچتی ہے۔ یہاں برقی رو آواز کی صورت میں منتقل ہوتی ہے۔ مکبّر کے استعمال سے یہ آواز اس قدر بلند ہو جاتی ہے وصولی آلے کے قریب بیٹھنے والے تقریر سن سکتے ہیں۔

(۱) آواز کی بالراست منتقلی سے کیا مراد ہے ؟

(۲) اس طریقۂ راست میں کیا سقم ہیں ؟

(۳) کیا طریقۂ راست بے تار پیام رسانی کے لئے موزوں ہے ؟

(۴) برقی مقناطیسی موجوں سے کیا مراد ہے ؟

(۵) بے تار پیام رسانی میں یہ موجیں کس غرض سے استعمال ہوتی ہیں ؟

(۶) ایریل سے کیا مراد ہے ؟

(۷) میکروفون کس لئے استعمال کیا جاتا ہے ؟

(۸) کسی نشرگاہ سے کوئی تقریر یا گانا کیونکر نشر کیا جاتا ہے ؟

(۹) وصولی آلے کا عمل کیا ہے ؟

تہذیب و اخلاق کی تدریس

(پرائمری جماعتوں کیلئے)

مقاصد:۔ تہذیب و اخلاق کے بنیادی اصول کی تعلیم دینا۔ لڑکوں کا اپنی اصلاح کو ترقی دینا۔

انتظامی مسائل کے حل کرنے میں مدد دینا۔

تربیت کردار کو معینہ اصول کے ذریعہ فروغ دینا۔

مصروفیات:۔

(۱) ہر بچہ کو چھوٹی چھوٹی کاپیاں دی جائیں ۔

(۲) پڑھنے کے لئے کہانیوں کی کتابیں دی جائیں ۔

(۳) کھیل ۔

(۴) مختلف جسمانی ورزشیں۔

(۵) پوسٹر تیار کئے جائیں ۔

(۶) اچھے اخلاق کا ایک شجرہ بنایا جائے ۔

(۷) شہر اور مدرسہ کے رسالوں کے لئے مضامین تیار کئے جائیں ۔

ارتباط باہمی:۔

انگریزی:۔ جملہ اور پیراگراف کی ترکیب ۔

مضمون نگاری:۔ صفائی ۔ ترتیب ۔ اور رموز اوقاف ۔

آرٹ:۔ دھندلا خاکہ ۔ ترتیب ۔ رنگ ۔ ڈزائن ۔ نقاشی ۔ اور خطاطی ۔

حفظان صحت:۔

جسمانی ورزشوں کی مشقیں ۔ کھیل ۔ اصول صحت ۔

طریقہ کار:۔

تہذیب گھر میں | گھر وہ جگہ ہے جہاں تہذیب کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ اس لئے بہتر ہوگا اس کی تعلیم گھر ہی سے شروع ہو۔ چونکہ اس بات کے معلوم کرنے کا کوئی اور طریقہ ظاہر میں معلوم نہیں ہوتا کہ آیا بچہ ان اصولوں پر جو مدرسہ میں تبلائے گئے ہیں گھر میں پابند ہے یا نہیں سوائے اس کے کہ خود معلم والدین کا تعاون حاصل کرے۔ بچوں کے گھروں کو جائے اور ان کے اسباق کو سمجھائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو بچہ کے بھائی بہنوں سے قابل بھروسہ معلومات حاصل کئے جائیں۔

معمولی گفتگو کے دوران میں اخلاق کے متعلق بحث کی جائے۔ بڑے بچے اخلاق کے سادہ اصولوں سے واقف ہوتے ہیں اور سبق کے سمجھنے میں ان معلومات سے بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔

مختلف اشاروں کی ایک فہرست تختہ سیاہ پر لکھ دی جائے جن کو بچے اپنی کاپیوں میں نقل کریں۔

ذیل کی فہرست میرے بچوں سے میں نے حاصل کی ہے:۔

جب کوئی مخاطب ہو تو فوراً جواب دو۔

جب بلایا جائے تو ہمیشہ جلد آؤ۔

اپنے بزرگوں کا کہنا بلا حجت مان لو۔

جب کوئی بات کر رہا ہو تو اس میں خلل مت ڈالو اور ادب سے سنو۔

دسترخوان کے آداب کا خیال رکھو۔

کیچڑ بھرے پیروں سے کمرہ میں مت داخل ہو۔

ہر قسم کے اصول لکھنے کے بعد کاپیوں کے سرورق تیار کئے جائیں۔ ایک اصول کو سرورق اور ایک تصویر سے اس کی وضاحت کرو۔ (پیٹرکن پال (Peterkin Paul) کی نظم مشکل سبق کے طور پر آئندہ لی جا سکتی ہے۔

قصہ کی کتاب | اس کتاب کی تمہید حسب ذیل قصہ سے کی جا سکتی ہے۔

(Peter Ken Paul) پیٹرکن پال کا قصہ:-

پیٹرکن ایک خراب لڑکا تھا جب کبھی اس کی ماں اس کو بلاتی وہ جواب نہ دیتا۔ وہ ہمیشہ کمروں میں کیچڑ بھرے پیروں سے جاتا۔ جب دوسرے لوگ باتیں کرتے تو خلل ڈالتا۔ دسترخوان پر جب وہ کھاتا تو ناگوار آوازیں نکالتا۔ جب اس کو برا بھلا کہا جاتا تو نادم نہ ہوتا۔ وہ ہمیشہ سب سے آگے چلنے کی خواہش کرتا اس لئے اپنی ماں اور بہنوں کے آگے چلتا۔ کسی کا شکریہ ادا کرنا، کسی سے معافی مانگنا یا سلام کا جواب دینا وہ نہیں جانتا تھا۔ جب صبح اٹھتا تو مغموم رہتا اور کسی کو سلام نہ کرتا۔ شام کے وقت وہ گھر جانے کی اتنی عجلت کرتا کہ اپنے اساتذہ کو سلام کرنا بھی بھول جاتا۔ اس کی ماں اس کو اکثر بھلا برا کہتی تو یہ بے تکے جوابات اس کو سناتا۔ پیٹرکن کے ساتھی ہمیشہ اس سے ناراض رہتے۔

ایک دن اس کی ماں نے اپنے لڑکے کو سدھارنے کی بہترین ترکیب سوچی۔ جب بچے مدرسہ سے گھر آئے تو وہ ان سے یوں مخاطب ہوئی۔

"بچو! آئندہ موسم سرما میں ہم اپنے چند احباب سے ملنے کے لئے جائیں گے اور دو ماہ وہاں رہیں گے۔ ہمارے احباب بڑے اخلاق والے ہیں اور آداب کے بہت پابند ہیں۔ انہوں نے ہم کو لکھا ہے کہ جب تک ہم اچھے اخلاق والے نہ بن جائیں وہ ہم سے نہیں ملیں گے۔ اس لئے میں اپنے ساتھ صرف ان بچوں کو لے جاؤں گی جو آداب کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔"

اس نے اس موقع پر پیٹرکن سے یہ نہ کہا کہ وہ بے ادب لڑکا ہے۔ ایسا کرنے میں وہ حق بجانب تھی۔

جب پیٹرکن بستر پر لیٹا ہوا تھا تو اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے آئندہ موسم بہار کی وہ تصویر نظر آئی جس میں اس کے دوسرے ساتھی مستی خوشی سے کھیل رہے تھے اس نے

محسوس کیا کہ اگر وہ اپنے اطوار کو نہ بدلے تو اس آیندہ کی خوشی سے اس کو محروم رہنا پڑے گا
اس خیال کا آنا ہی تھا کہ لڑکا ممکنہ کوشش پر کمربستہ ہو گیا اور تہذیب و آداب کے اصولوں کی
پابندی میں اور بچوں سے سبقت لے جانے کی دل میں ٹھان لی۔

میں نے بچوں کو یہ کہانی سنائی اور ان کو یہ سمجھایا کہ ان کو اس قصہ کی تکمیل کرنی ہے۔
تکمیل کے لئے وہ کہانیاں لی جائیں جن میں یہ بتلایا گیا ہو کہ پیٹرکن نے کس طرح اپنی اصلاح
کی کوشش کی۔ ایک قسم کے قصے ایسے ہوں جو یہ واضح کریں کہ گھر میں پیٹرکن نے کن اصولوں
سے اپنی بری عادتیں بدل ڈالیں۔ ہر بچہ کو اجازت دی گئی کہ کسی ایک اصول کو منتخب کرے
اور اس کے متعلق ایک قصہ لکھے۔ ذیل کا قصہ چہارم جماعت کے ایک طالب علم نے لکھا ہے۔

ایک دن پیٹرکن دسترخوان پر کھانا کھا رہا تھا۔ اپنی بہن سے اس نے درشت لہجہ میں کہا
"مکھن دو"۔ کسی نے اس کی بات کی پرواہ نہ کی۔ پیٹرکن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لیکن دفعتاً اس کو
آیندہ موسم بہار کے سفر کا خیال آ گیا جس میں اس کی ماں ایسے ہی بچے ساتھ لے جانا چاہتی ہے
جو باادب ہوں۔

اس لئے اس نے کہا "پیاری بہن! براہ مہربانی تھوڑا مکھن مجھے بھی دیجئے"۔
اس پر اس کی بہن نے اس کو مکھن دیا۔ بیچارہ پیٹرکن ایسے موقع پر کیا کہنا چاہئے
یاد نہ رکھ سکا۔ آخرکار اس کی زبان سے "معاف فرمائیے" کے بے موقع الفاظ نکل گئے۔ اس کے
باپ نے ماں کو اشارہ کیا۔ دفعتاً لڑکے کو یاد آ گیا اور اس نے کہا "بہن آپ کا شکریہ"۔ اس مرتبہ
اس کی آواز صاف اور خوشی سے بھری ہوئی تھی۔

مدرسہ میں آداب کی تربیت

پہلے سبق کی طرح اس کا بھی آغاز اسی طرح ہو سکتا ہے۔
ذیل میں وہ فہرست دی جاتی ہے جو ہمارے بچوں نے تیار کی ہے

آپ کا شکریہ۔ آپ کی مہربانی۔ معاف فرمائیے۔ السلام علیکم۔ لڑکیوں کے ساتھ کس طرح
برتاؤ کرنا، ساتھیوں اور اساتذہ کا لحاظ رکھنا اور دوسری ایسی چیزیں جن کا تعلق آداب سے

ہے۔اس سلسلہ میں بچوں نے ایک کھیل اور تین ورزش جسمانی کی مشقیں تیار کیں۔
کھیل کا نام ٹیڑھوں کی اصلاح کرنے والا کھیل رکھا گیا۔ اور اس کھیل کو اس طرح کھیلا گیا۔
ایک لیڈر منتخب کیا گیا۔کھیل شروع کرنے کے پہلے اس نے ایک فہرست ان چیزوں کی
تیار کی جن کے متعلق وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے بچے اس کے سامنے ایک قطار میں کھڑے
ہوگئے۔ ان سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اس کے ہر حکم کو مانیں گے۔
اس کی تیار کردہ فہرست حسب ذیل ہے:۔
ا کھیل کے میدان پر کسی غیر صحیح واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کی اطلاع دینا۔
۲۔یہ حکم دینا کہ وہ اپنے لیڈر کے ہمراہ جانے کے لئے تیار ہوں۔
۳۔لیڈر کا اپنے آپ کو استاد ظاہر کرنا اور بچوں کو برخواست کر دینا۔
۴۔ہر بچہ کو کمرۂ جماعت کے چھوڑ دینے کا حکم دینا (لڑکوں کو چاہئے کہ لڑکیوں کو پہلے
جانے دیں)۔
مدرس کی مدد سے لیڈر کئی ایک باتوں کا خیال کر سکتا ہے ایسا بچہ جس نے اس کھیل کے
دوران میں اصول آداب کی خلاف ورزی کی ہو وہ ہار جاتا ہے اور ایسا بچہ جس نے سب سے
کم غلطیاں کی ہوں لیڈر منتخب کیا جاتا ہے۔ بچے چونکہ لیڈر بننا پسند کرتے ہیں اس لئے اصول
آداب کی پابندی میں اس درجہ کے حصول کے لئے انتہائی کوشش کرتے ہیں۔

جسمانی ورزش کی مشق نمبر ۱۔

کمرہ سے چلنا۔ سیدھے چلنا۔ قدم ملا کر چلنا۔ لڑکیوں کو لڑکوں کے آگے چلنے کا موقع دینا۔

جسمانی ورزش کی مشق نمبر ۲

پنسل گرانا:۔ بچے ایک قطار میں سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ استاد ان کے سامنے ہوتا ہے
لفظ "تیار" کے ساتھ مدرس پنسل گراتا ہے۔ پھر نمبر ایک کے ساتھ بایاں پیر پیچھے رکھنا۔
نمبر ۲ کے ساتھ آگے کی طرف جھک جانا اور انگلیوں کے سروں سے زمین کو چھونا۔ اس عرصہ میں

سیدھے زانو کو سخت رکھنا اور بایاں پیر اپنی جگہ سے نہ ہٹانا۔ نمبر تین کے ساتھ پہلی حالت میں کھڑا ہو جانا جسمانی ورزش کی مشق نمبر ۲ :۔ (صرف لڑکوں کے لئے)۔
یہاں اس اصول پر زور دیا جائے کہ لڑکا اپنی انگریزی ٹوپی چھوئے ہی نہیں بلکہ ذرا اٹھاکر اپنے سر پر پھر رکھ لے۔

ٹوپی نکالنا۔

لڑکے ایک قطار میں سیدھے کھڑے ہوں۔
نمبر (۱) کے ساتھ اپنا سیدھا ہاتھ پیشانی تک اٹھائیں۔
نمبر (۲) کے ساتھ سیدھا ہاتھ اپنی جگہ ہو۔
نمبر (۳) کے ساتھ بایاں ہاتھ پیشانی تک اٹھاؤ۔
نمبر (۴) کے ساتھ بایاں ہاتھ اپنی جگہ پر۔
اس مشق کو سبق کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ اس کھیل اور ان مشقوں کے استعمال کے لئے۔ اپنی کاپیوں میں مزید اوراق کا اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔
کمرۂ جماعت کے اصول آداب تصاویر کے ذریعہ بھی واضح کئے جا سکتے ہیں۔
اصول آداب کھیل کے میدان پر :۔
میرے بچوں نے ذیل کی فہرست اس ضمن میں اپنے جماعت کے گھنٹوں میں تیار کی۔ کھیل میں اصول و آداب کا لحاظ۔ اسپورٹس مین شپ، ہمدردی، ان میں کی ہر سرخی پر ایک چھوٹا سا مضمون لکھوا اس چھوٹے سے مضمون میں لکھنے والے سے یہ توقع کی جائے کہ اس کا کھیل کے میدان پر اسپورٹس مین شپ کا کیا تصور رہے۔ سبق کے اور حصوں کا لحاظ کھیل کے میدان پر ہو۔ آداب کے خلاف کسی نافرمانی کی حرکت کو لکھ لیا جائے اور جس نے ایسی حرکت کی ہو اس کے اعزاز میں کمی کر دی جائے۔ کوئی بچہ کھیل میں درشت اور خراب طریقہ استعمال کرے تو اس کو فوراً نکال دیا جائے۔ یہ انتہائی سزا ہے، اور کوئی طالب علم

اس کو پسند نہیں کرتا۔ اس لئے مدرس کی عدم موجودگی میں بھی کھیل کا ضبط اچھا رہتا ہے۔

اصول آداب عوام کے ساتھ۔ وہ اصول آداب جن کا تعلق عوام کے ساتھ ہو تختہ سیاہ پر لکھے جائیں اور ان کو اپنی کاپیوں میں درج کر لیا جائے۔ ان اصول کو تصاویر کے ذریعہ واضح کیا جائے۔

ذیل کے اصول میرے طلبہ نے تیار کئے :-

اپنے جان پہچان کے لوگوں کو سلام کرو۔ اپنے ساتھیوں کے ملنے جلنے والوں کو سلام کرو۔ بڑوں کی عزت کرو۔ مجمع میں مت گھسو۔ موٹربس اور دیگر سواریوں میں سوار ہوتے وقت بوڑھوں اور عورتوں کو پہلے سوار ہونے دو۔ سڑکوں کے عبور کرنے میں بوڑھوں کی مدد کرو۔ ٹکٹ گھر پر اپنی باری کے وقت ہی ٹکٹ خریدو۔ کسی بھری ہوئی موٹربس میں کسی بوڑھے آدمی کو جگہ نہ ملے تو اس کو اپنی جگہ دو۔

انجام اس قسم کے چند اسباق کے بعد بچوں میں بہت بڑی اصلاح پائی گئی۔ آداب کی راست تعلیم ہی سے مقصد میں کامیابی ہو سکتی ہے۔ ان اسباق میں بچے ہی زیادہ کام کرتے ہیں اور استاد پر زیادہ بار نہیں ہوتا۔ اس لئے ان اسباق کا اچھا اثر دیرپا ہوتا ہے۔

جنس ثالث

اس وقت ہندوستان میں ایک ایسی زبان کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے جو ہندوستان کے تمام صوبوں کے پڑھے لکھے اشخاص آسانی سے سمجھ اور بول سکیں۔ اور اقطاع ہندوستان میں خط و کتابت کے لئے انگریزی کی بجائے استعمال میں لائی جاسکے۔ چنانچہ اس غرض کے مدنظر ہندوستانی (اردو، ہندی) زبان منتخب ہوچکی ہے۔ اگرچہ یہ ہندوستانی زبان بہت آسان ہے مگر اردو، ہندی، سنسکرت، عربی اور فارسی کے جو الفاظ ہندوستان کی تمام زبانوں میں مشترک ہیں ہندوستانی میں استعمال کئے جائیں تو ہندوستانی اور آسان ہوجائے گی ہندوستان کی جملہ زبانوں کے محاوروں میں بھی بہت زیادہ یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اگر اس کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو ہندوستان کے ہر صوبہ کا رہنے والا شخص نہایت آسانی سے اس زبان کو سیکھ اور سمجھ سکے گا۔ ہندوستانی زبان میں جو قابل اصلاح نقص ہے اس کی اصلاح بظاہر ناقابل قبول اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے مگر نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

دکن کے کنڑے تلنگے حضرات کی اردو بات چیت سنکر ٹھیٹ اردو یا ہندی والے حضرات کو ہنسی آتی ہوگی مثلاً "زنانہ آئی"۔ "دھی میٹھی ہے"۔ "بارش آتا ہے"۔ "کھیت بڑی ہے"۔ "ماں کا ماتا موت آیا" وغیرہ جملے غلط طریقہ پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہنسی کا آنا ضروری ہے کیونکہ پڑھے لکھے لوگ اس قسم کے معمولی معمولی چھوٹے چھوٹے جملے بھی صحیح طور پر ادا نہیں کرسکتے۔ اس طرح کی ان سے فاش غلطیاں سرزد ہوتی ہیں؟ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کی غلطیوں کی اصل کہاں ہے؟ ان کی اصلیت ان کی مادری زبانوں میں ہے۔ کنڑی، تلنگی، ٹامل (دراوڑی) زبانوں میں صرف انسانوں کے لئے جنسی الفاظ خصوصاً طبقہ

ذکور کے لئے مذکر طبقہ اناث کے لئے مونث استعمال میں آتے ہیں بقیہ تمام حیوانات واشیاء کے لئے جنس ثالث استعمال میں آتی ہے جیسا کہ انگریزی میں Neuter Gender ہے اس لئے ان زبانوں میں جنس کا جھگڑا اور پیچیدگیاں بالکل نہیں ہیں جنسی الفاظ کے استعمال میں بڑی سہولت اور آسانی ہے ان زبانوں میں تذکیر و تانیث کا استعمال شخص یا چیز کے لحاظ سے ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کے لحاظ سے اس لئے وہ لوگ اردو کے صحیح جملوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھتے ہیں البتہ "گائے آئی" "بیل آیا" وغیرہ کہنا دکو دراوڑی زبانوں کے محاورے کے لحاظ سے درست نہیں غیر درست نہیں ہوسکتا کیونکہ ان میں قدرتاً جنسی فرق موجود ہے۔ لیکن جب کہا جاتا ہے کہ "اچھی دیوار گرتی ہے" تو سننے والے کے دل میں ایک ہیجان سا پیدا ہوتا ہے اور اس کو تعجب ہوتا ہے کہ دیوار تو کسی کی بہو، بیٹی، بہن، بیوی یا ماں نہیں ہے۔ پھر اسے طبقہ اناث میں کیوں شریک کیا گیا؟ "الزام لگایا گیا"۔ "تہمت لگائی گئی" یہاں "الزام" مذکر "تہمت" مونث استعمال ہوئے ہیں اسی طرح پانی پڑا، بارش ہوئی میں "پانی" اور بارش کی حالت ہے "ہوا آئی"۔ "وایو آیا"۔ "گھٹا چھائی"۔ "ابر چھایا" وغیرہ میں۔ تذکیر و تانیث کا یہ استعمال کتنا ہی دلچسپ اور فصیح و بلیغ کیوں نہ ہو غیر اردو یا ہندی داں کے لئے سخت تکلیف دہ اور مایوس کن ہے۔ اپنے آسان اور قدرتی جنسی قواعد کے مقابلہ میں ان کو اردو یا ہندی کے جنسی قواعد غیر قدرتی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے اوس کے سمجھنے میں انہیں دقت ہوتی ہے۔ یہ حالت صرف اردو کی ہی نہیں بلکہ شمالی ہند کے جملہ زبانوں کی ہے۔

اب ناظرین غور کرسکتے ہیں کہ دکنی (دراوڑی) زبان والوں کی غلطی متعلقہ تذکیر و تانیث، بے وجہ نہیں ہے۔ مطلب یہ نہیں کہ ہندی یا اردو (ہندوستانی) زبان قومی بننے کے قابل نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس میں ہندوستان کی جملہ زبانوں کی خصوصیات شامل کر کے عام فہم زبان بنائی جائے اردو اور ہندی میں حروف کی اصلاح ہوتی جا رہی ہے،

وضع الفاظ میں بھی جدو جہد کی جارہی ہے جس زبان کو عالم گیر بنانا چاہتے ہیں۔ اس میں ان خوبیوں کو جمع کرنا بھی لازمی ہے جو ایک ہی ملک کے مختلف حصص میں بولی جانے والی زبانوں میں موجود ہیں۔ کیا قدیم ترین انگریزی کی اور آج کل کی انگریزی کی شکل وصورت ایک ہی ہے؟ شیکسپیر کی زبان ہی لیجئے اس کے لئے قواعد ہی الگ ہیں اور اس سے پرانی انگریزی میں لاطینی کی طرح گردانیں موجود ہیں۔ کیا ایک ضروری جنسی قاعدہ کی ترمیم سے اردو زبان کی خوبی نہیں بڑھے گی؟ جن اشیاء، جانور یا اشخاص کے نرادہ و مادہ ہونے میں امتیاز کرنا مشکل ہے اون کے لئے جنس ثالث کا ہی استعمال کیا جائے تو مناسب ہے۔

کیا زبان اردو یا (ہندوستانی) میں پھیلاؤں کا مادہ نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیا وہ ہندوستان بھر میں پھیل کر بین الصوبہ جاتی زبان ہو کر رہ سکتی ہے؟ دراوری زبانوں سے رشتہ جوڑنے سے ہی ہندوستانی زبان دڑاوری صوبوں میں (یعنی جنوبی ہند) میں سرعت سے رائج ہو سکے گی یہ اس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ ہندوستانی زبان دڑاوری زبانوں کے واجب اصولوں کو اپنانے کی کوشش کرے۔ تو یقین ہے کہ ہندوستانی زبان میں نئے خیالات اثر پڑیں گے نئے جوش کے ساتھ ادبی خزانہ بڑھے گا۔ شاعری میں یا فصاحت وبلاغت میں مذکر ومونث پرانے اور نئے دونوں طریقوں سے استعمال کئے جاسکتے ہیں لیکن۔ نثر۔ اخبارات وغیرہ میں باضابطہ تین جنسوں کا استعمال رہنا چاہئے۔ اگر تمام اخبارات اور ادیب توجہ کریں تو دو چار سال میں ہی یہ رواج منتقل ہو جائے گا کیونکہ اردو داں یا ہندی داں حضرات کو اس میں کوئی دقت بھی پیش نہیں آئے گی اس سے جنوبی ہند والوں کو بہت آسانی ہو گی میری یہ تحریر صرف سن کر چھوڑ دینے کے لئے یا سکرا کر دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ غور و فکر کر کے مستعدی کے ساتھ عمل میں لانے کے لئے ہے۔

اس لئے میں چند تحریکات قلمبند کر دیتا ہوں (مثال کے طور پر)

جیسا کہ مذکر کی علامت "ا" ہے اور مونث کی "ی" ویسے ہی جنس ثالث کی علامت "ــَـ" (زبر) ہونا ٹھیک ہوگا مثلاً لڑکی جاتی ہے۔ لڑکا جاتا ہے وقت جاتَ ہے۔ اچھی بیٹی آتی ہے۔ اچھا بیٹا آتا ہے (نیکوں کو) اچھ موت آتَ ہے۔ رانی چلتی ہے۔ بادشاہ چلتا ہے حکومت چلتَ ہے۔ اچھ دیوار گرتَ ہے۔ بارش ہوتَ ہے۔ برسات ہوتَ ہے۔ پانی پڑتَ ہے۔ اس زبر کو لازمی طور پر لکھنے کا رواج رکھنا چاہیئے (جنس ثالث کے لئے "م" یا "و" کا اضافہ ہو جائے تو بھی مضائقہ نہیں جیسا اچھم پانی۔ اچھم دیوار۔ اچھو پانی یا اچھو دیوار)۔

ہمارے عثمانیہ یونیورسٹی میں پہلے پہل اردو میں جب سائنس وغیرہ پڑھائی جانے لگی تو بعض لوگوں کو ہنسی آتی تھی لیکن اب خوشی ہوتی ہے۔ اسی طرح پہلے پہل ایسے الفاظ کے استعمال سے ہنسی ضرور آئے گی لیکن رواج میں آنے کے بعد بہت سے مسائل آسانی سے حل ہو جائیں گے میں عبارت ذیل جنس ثالث کو استعمال میں لا کر لکھتا ہوں ناظرین آسانی سمجھ سکیں گے۔ مذکر و مونث اور جنس ثالث کے لئے علامت اضافت بالترتیب کا۔ کی۔ کَ اور دوسرے علامات گا۔ گی۔ گَ اور میرا۔ میری۔ میرَ ہے گا علیٰ ہذا القیاس اردو میں یعنی ہندوستان کَ بین الصوبہ جاتی زبان میں جنس ثالث کَ اضافہ ضروری ہے اس سے زبان وسیع ہوتَ ہے جنوبی ہند کے لوگ اسے بآسانی سیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح کرنے سے جن لوگوں کی مادری زبان ہندوستانی ہے ان کو کوئی شدید دقت نہیں ہوگَ۔ ہندوستانی کَ خوبی یہ ہوتَ ہے انگریزی کَ ضرورت نہیں پڑتَ ہے بہ نسبت انگریزی کَ ہندوستانی آسان ہے اور اور بھی آسان ہو جائیگی جب کہ جنس کَ تبدیلی ہو جائیگی۔ ہمارا استدعا ہے کہ اردو داں و ہندی داں حضرات دراوڑی زبان والوں کَ تکلیف دور کرنے کَ کوشش فرمائیں تو مناسب ہے۔ دراوڑی زبان میں جنس کَ استعمال قدرتی اور آسان ہے ان اصول کَ اختیار کرنا ہندوستانیوں کے لئے یعنی اردو و ہندی والوں کے لئے مضر نہیں بلکہ مفید ہے یہ میرَ رائے ہے ناظرین اپنَ اپنَ رائے میرے پاس بھیجنے کَ مہربانی فرما سکتے ہیں۔

تنقیح امتحانات

سر فلپ ہار ٹاگ اور ڈاکٹر ای۔ سی۔ او ڈس نے منجانب بین الاقوامی انجمن تحقیق امتحانات حال میں متذکرہ عنوان کے تحت جو رسالہ جاری کیا تھا پریس نے اس کی خوب اشاعت کی اور اس کے ساتھ عام پبلک کی بہت زیادہ دلچسپی کو تیز تر کر دیا۔ اور بعض مراکز میں بے چینی اور خوف بھی پیدا ہوگئے۔ ایسے لوگوں کے افادہ کی خاطر جن کو مذکورہ رسالہ کے مطالعہ کا موقع نہیں مل سکا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس امر کی توضیح کر دی جائے کہ وہ کون جماعت ہے جس نے ان تحقیقات کا بیڑا اٹھایا ہے جس کا اختصار رپورٹ ہذا میں مرقوم ہے بمقام ایسٹ بورن (East Bourne) ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد زیر سرپرستی کارنیگی کارپوریشن (Cornegie poration) کارنیگی فونڈیشن اور بین الاقوامی انجمن کلیہ مدرسین کولمبیا یونیورسٹی ممالک متحدہ امریکہ ماہ مئی ۱۹۳۱ء میں ہوا۔ انگلستان اسکاچستان۔ فرانس جرمنی۔ سوئزرلینڈ اور ممالک متحدہ امریکہ کے نمائندے شریک کانفرنس رہے۔ کانفرنس کے انعقاد کے نتیجہ کے طور پر ہر ایک متذکرہ صدر ملک میں کمیٹیاں قائم ہوئیں جنہوں نے اپنے اپنے طور پر آزادانہ کام کیا اور اپنے کاموں کی نسبت رپورٹیں دوسری کانفرنس میں جس کا انعقاد گذشتہ جون میں ہوا تھا پیش کیں۔ انگریزی کمیٹی کے ارکان سر مائیکل سیڈلر (Sir Michael Sadler) صدر سر فلپ ہارٹاگ (Sir P. J. Hartog) ناظم پروفیسر سی۔ برٹ (Prof. C. Burt) پروفیسر سر پرسی نن (Prof. Sir Percy Nunn) پروفیسر سی۔ اسپیرمن (Prof. C. Spearman) پروفیسر گراہام ولیس۔ ڈاکٹر پی۔ بی۔ بلارڈ اور ڈاکٹر سی ڈبلیو برنس (Dr. C. W. Burns) منتخب تھے ۱۹۳۲ء میں پروفیسر گراہام ولیس کے انتقال پر ان کی جگہ پروفیسر گاڈفرے تھامسن نے لی اور پروفیسر ایچ آر

ہیملی اور سی۔ ڈبلیو۔ وانسٹائن نے من بعد شرکت کی۔

ڈاکٹر ای۔ سی۔ اوڈس بحیثیر اعداد و شمار کی حیثیت سے کام کرتے رہے وہ کام جس کا اس کمیٹی نے بیڑا اٹھایا۔ تنقیح امتحانات کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن حقیقت میں جیسا کہ نام کی سرخی سے ظاہر ہے۔ اس سے محدود تر تھا۔ کمیٹی نے جو کچھ کام بھی حقیقت میں کیا وہ خود ممتحنین کے امتحان کی کوششیں تھیں کہ جانچیں اور اطمینان کریں کہ وہ اپنا فرض کس حد تک قابل اطمینان طریقہ پر انجام دیتے ہیں اور دیکھیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ ان میں کس حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے اور خود وہ کہاں تک اپنے کام میں یکسانیت کا عمل رکھتے ہیں۔

ان کا یہ ادعا ہے کہ جب کہ اس کے قبل ایسی ہی تنقید اور جانچ کی گئی تھی تو بہت سے مختلف ممتحنین کے پبلک امتحانوں کے جوابات پر عطا کئے ہوئے نشانات کا باقاعدہ تقابل شائع نہیں ہوا۔ وہ حقیقی طور پر اس بات کی جانب توجہ دلاتے ہیں کہ آج کل پوری معاشرہ کی زندگی میں امتحانات نے بہت نمایاں اور اہم حصہ لے لیا ہے نہ صرف تمام مدارس جامعاتی زندگی میں بلکہ بہت سے پیشوں میں بھی شرکت کا ذریعہ ہیں۔ فرانسیسی اور انگریزی کمیٹیوں نے تحقیقاتی نتائج جو علیحدہ علیحدہ طور پر اخذ کئے گئے تھے۔ بہت ملتے جلتے تھے مصنفین کا دعویٰ ہے کہ اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ امتحانات جن پر زندگی کا دارومدار ہے اس میں موقع اور اتفاق کو بڑا دخل ہونا چاہیئے؟ بعد وہ خود اپنے نتائج کو متردد اور بے چین بنانے والا لگتے ہیں۔ ان اخذ کردہ نتائج کی اہمیت کے متعلق حقیقت میں کوئی سوال پیدا ہو ہی نہیں سکتا اب آیا یہ جانچ کہ ان طریقوں پر غور کرنا چاہیئے۔ جن پر انگریزی کمیٹی نے عمل کیا۔ اول کمیٹی نے تجزیہ کرنے کے ارادہ سے ایک یا دوسرے امتحان کے امیدواروں کے جوابی پرچوں کو لیا اور پھر نشانات اور ان آرا کو جو ممتحنین نے پرچوں پر درج کئے تھے کامل طور پر مٹا دیا اور پھر ان پرچوں کو یا ان کے عکس نقول کو ایسے ممتحنین کے پاس جو منتہی کا بڑا تجربہ رکھتے تھے اور جو اس تحقیق و تفتیش میں کمیٹی کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ تھے روانہ کیا۔

اس تحقیق کے لئے جن امتحانات کا بحیثیت نمونہ انتخاب کیا گیا وہ بعض اسکول سرٹیفکیٹ امتحان تھے جو مضامین ذیل میں لئے گئے۔ تاریخ انگریزی۔ لاطینی۔ فرانسیسی اور کیمیا۔ انگریزی حساب کا باہم ایک خاص تقابلی امتحان اور انگریزی مضمون نویسی کالج کے داخلہ کا ایک امتحان (اس امتحان میں بھی مضمون انگریزی مضمون نگاری تھا) اور یونیورسٹی آنرز امتحان بہ مضمون ریاضی و تاریخ علیحدہ علیحدہ اور ایک زبانی امتحان بھی تھا۔ آخر الذکر خود ایک علیحدہ قسم و درجہ کا امتحان تھا کیونکہ ظاہر ہے کہ اس کا تجربہ دیگر امتحانات کے بمقابل ایک علیحدہ ہی طریقہ پر کیا جانا چاہئے تھا۔ ممتحنین کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا گیا جنہوں نے آزادانہ ایسا ہی (سابقہ امتحان دادہ) امیدواروں سے گفت و شنید کی۔ یہی ایک تنہا واقعہ تھا جب کہ باہمی امداد سے کام لیا گیا تھا۔ زبانی امتحان کا مقصد بھی دیگر امتحانات سے جداگانہ تھا یعنی امیدواروں کی۔ ذکاوت۔ ذہنیت۔ اور عام ہوشیاری کی نہ کہ کسی خاص مضمون میں قابلیت کی جانچ کرنی تھی۔ دیگر تمام صورتوں میں ممتحنین نے بالکل اپنے اپنے طور پر علیحدہ کام کیا تھا۔ اور حقیقت میں ان کا اس طرح علیحدہ علیحدہ آزادانہ کام کرنا ہی تحقیق و تفتیش کی جان تھی۔

لیکن یہ جانچ و تنقیح مختلف ممتحنوں کے ایک ہی جوابی پرچوں کی آزادانہ تنقیح وغیرہ و نمبر اندازی کے نتائج کے سادہ مقابلہ سے بھی کچھ بڑھ چڑھ گئی۔ مقصد تو یہ تھا کہ ہر ایک ممتحن کے نتائج کا صرف دیگر ممتحنین کے نتائج سے ہی مقابلہ نہ کیا جائے۔ بلکہ خود انہیں کے نتائج سے بھی مقابلہ ہو۔ اور جوابی پرچہ جات جو ایک وقت جانچے جا چکے تھے ایک سال کے وقفہ کے بعد ان ہی ممتحنین کے پاس مکرر جانچ کے لئے روانہ کئے گئے تھے۔ ان تجاربہ سے کس قسم کے نتائج اخذ کئے گئے؟ اس رسالہ کے ناظرین کو ہم اب اپنے ہی مضامین سے دلچسپی ہوگی اور چونکہ اس مختصر سی رپورٹ کے اندر جملہ مضامین کی جانچ و تنقیح پر بحث کرنا نا ممکن ہے۔ اس لئے ہم مضمون تاریخ کے ہی امتحان کے بیان پر اکتفا کریں گے اور ایسا کرنے میں کافی معقولیت بھی ہے کہ سب اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ تنقیح و جانچ کے لئے تاریخ ایک

مشکل ترین مضمون ہے۔ ابتدائی حساب کے سوالوں کا جواب یا تو صرف صحیح ہوتا ہے یا غلط اور انسانیاتی مضمون کے مقابل ریاضی یا قواعد کے پرچہ کی صحت و امتیاز میں وسعت کا امکان ہمیشہ بہت ہی کم رہتا ہے۔ اس لئے اول الذکر قسم کے علمی یا انسانیاتی پرچوں کی ہی نشاندہی میں ممتحنوں کا فرق نمایاں ہوسکتا ہے اور ان ہی مضامین میں جانچ کے ایک معیار اندازہ کا تعین بہت مشکل ہوتا ہے۔

اولاً ہم پرچہ امتحانی اسکول سرٹیفکٹ کے مضمون کی نمبر اندازی کے تجربہ کے نتیجہ پر غور کریں گے۔ ایک امتحانی بورڈ کے مہیا کردہ پندرہ جوابی پرچہ جات کا انتخاب کیا گیا ان تمام پرچوں پر اوسط درجہ کے نمبر ان ممتحنوں نے لگائے تھے جن کو عہدہ داران امتحان متعلقہ نے مقرر کیا تھا۔ پندرہ ایسے اشخاص نے جو اپنے آپ کو اس کام میں کمیٹی کو مدد کرنے کے لئے پیش کیا تھا علیحدہ اپنے طور پر ہر آزادانہ ان پرچوں کو دوبارہ جانچا۔ نمبر دیا اور پھر (چونکہ پندرہ ہی شخص سے مکرر جانچ نہ ہوسکی) چودہ اشخاص نے بارہ اور انیس ماہ کے وقفہ کے بعد ان پرچوں کی دوبارہ تنقیح کی اور نئے نمبر دئے۔ اب جب کہ باقاعدہ امتحان کے وقت ان پرچوں کو تقریباً ایک ہی جیسے اوسط درجہ کے نمبر دئے گئے تھے ان دوسرے ممتحنوں نے (۹۶) نمبر کے منجملہ (۲۱) تا (۷۰) تک نمبر دئے۔ ان رضاکار ممتحنوں کے درمیان میں نمایاں فرق تھا۔ ایک تمثیل یہ بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ ایک ہی پرچہ جواب کو جب دو مختلف اوقات میں جانچا گیا تو ان مختلف اوقات میں دئے ہوئے نمبروں میں (۳۰) کا فرق تھا اور تنقیح اولی اور تنقیح ثانی کے موقعوں پر ایک ہی پرچہ کی نسبت جس رائے کا اظہار کیا گیا تھا ان میں بھی نمایاں فرق تھا ایک ممتحن نے نو پندرہ کے منجملہ آٹھ کی نسبت اپنی رائے بدل ہی دی بعض موقعوں پر ممتحنین نے اپنی جانچ کا معیار بوقت تنقیح ثانیہ بدل دیا تھا۔ پس سوال کیا گیا ہے "کہ ان نتائج کے انتہائی اختلاف کے مد نظر اسکول سرٹیفکٹ کے پرچہ جات تاریخ کی نمبر اندازی پر کس قطعیت کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ اب ہم دوسری طرف

امتحان یونیورسٹی ہسٹری آنرز کی نسبت غور کریں گے متعلقہ یونیورسٹی نے کمیٹی کو چند جوابی پرچہ جات مہیا کر دئے جو چار پرچہ جات سوالیہ ۔ تاریخ قدیم و زمانہ وسطی ۔ تاریخ زمانہ وسطی وحال ۔ مضمون نگاری ۔ پرچہ سیاسیات ۔ کے جواب میں لکھے گئے تھے ۔ اس تجربہ میں (۱۷) آدمیوں نے حصہ لیا ۔ جن کے منجملہ (۹) تاریخ کے پروفیسر تھے اور ایک شخص کے سوائے دوسرے تمام آکسفورڈ یا کیمبرج کے اساتذہ تاریخ تھے پرچوں پر ۔ الف ب ۔ ج ۔ د ۔ طریقہ پر نمبر دئے گئے تھے ۔ اس کا نتیجہ رپورٹ کمیٹی کے صفحات ۔ ۴۴ تا ۶۲ تختہ کی شکل میں دیا گیا ہے اس تختہ کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے ایک جوابی پرچہ جس پر ایک ممتحن نے صرف ۔ الف ۔ نمبر دئے ۔ دوسرے دو نے منفی اور چوتھے نے الف و ب اور پانچویں نے اس کو ب ۔ ج اور چھٹے نے ج + تک نمبر دئے ایک اور ظاہرا کمزور پرچہ پر ایک ممتحن نے (ب ؟) تک اچھے نمبر دئے تو بہتوں نے کسی قسم کا ۔ ج) نمبر دیا ۔ لیکن ایک ممتحن نے ۔ د ۔ کا بالکل تباہ کن نمبر دیا ۔ اگر ان آٹھ ممتحنین کی رائے کا جنہوں نے چار میں سے تین پرچوں پر نمبر دئے تھے مقابلہ کیا گیا ۔ تو پایا گیا کہ ان میں کے پانچ نے چند جوابات کو الف درجہ کا ہوتا پایا لیکن دیگر ۔ تین نے ایسا ہرگز نہیں کیا ۔ مکرر یہ کہ ان میں کے پانچ ممتحنین نے صاف اور پر چند پرچوں کو (د) درجہ کا ہوتا پایا تو دیگر تین کی رائے ان ہی کے نسبت ایسی نہ تھی لیکن آخرالذکر کے ایک نے (د) کا نشان عطا کیا اور کسی اور نے ایسا کیا ہی نہیں ۔ کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں پائی گئی کہ ایک ہی پرچہ کو تمام ممتحنوں نے ایک ہی درجہ کے نمبر دئے ہوں اور "ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان ممتحنین کے معیار میں ہی نصف درجہ کا فرق پایا جاتا ہے" اگرچہ ان میں کا ایک ممتحن جو عادتاً اپنے دیگر ساتھیوں کے مقابل کمتر نمبر دیا کرتا ہے نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔ شاید جو مثالیں کہ اوپر پیش کی گئی ہیں وہ ہمارے مضمون کے مقصد کے لئے کافی ہیں ۔ اس پریشان کن رپورٹ کے صفحات سے بدترین مثالوں کا ہی انتخاب کیا گیا ہے پس ان پیش کردہ شہادتوں پر غور کرنے کے

بعد یہ نتیجہ جو امتحان طریقہ کی نسبت ظاہر ہوتا ہے۔ نرم الفاظ میں اس کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت ناقابل اعتبار ہے۔

اور یہ بات غیر معقول سی معلوم ہوتی ہے اس رسالہ کے مصنفین نے خود اپنے سوال کے جواب میں آیا امتحانات موقوف کر دئے جائیں یا ان کا کیا علاج تجویز کیا جائے۔ یہ بیان کرتے ہیں "کہ کمیٹی اصول امتحان کے پوری پوری طرح مسدود کرنے کی سخت مخالف ہے ان کی یہ رائے ہے کہ "امتحانات قابلیت کی جانچ کے لئے ضروری ہیں لیکن موجودہ خرابیوں کے اندفاع کا کوئی علاج نہیں بتاتے۔ یہیں ان کا نتیجہ خود ایک تعجب انگیز چیز ہو جائے گا جب کہ یہ تمام تفتیش و تحقیق جو کمشنر کی جانب سے عمل میں آئی ہے حقیقت میں امتحانات کی تنقیح ہی ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ انہوں نے ممتحنوں کی تحقیق کی ہے جو بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ طریقہ امتحانات پر ابھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے جو اس رسالہ میں مذکور نہیں ہے اور جس کو بلاشبہ اراکین کمیٹی فوراً تسلیم کر لیں گے۔ اور جیسا کہ خود تمہید میں بھی اس کا اظہار کیا گیا ہے لیکن ہم ایک بات پر زور دیں گے کہ جو شہادت کمیٹی نے پیش کی ہے اس کے اثرات کو سمجھنے اور اس کی اہمیت کا غیر جانبدارانہ اندازہ لگانے کے لئے یہ لازم ہے کہ ہم ان دوسری باتوں کو بھی پیش نظر رکھیں جن کا رپورٹ کی اشاعت کے بعد اخبارات رسائل اور تعلیمی کانفرنسوں کی تقریروں میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ عام طور پر امتحانات کو ہردلعزیزی حاصل نہیں ہے بعض لوگ ایسے بھی ہیں۔ جو اس سے لطف اٹھاتے ہیں اور غالباً ایسے لوگوں کی تعداد جس قدر کہ عام طور پر سمجھی جاتی ہے بہت زیادہ ہے لیکن ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو خود زیر امتحان ہونے میں کوئی لطف نہیں پاتے۔ یہ بہت آسان ہے کہ امتحان پر عام طور پر لعنت و نکتہ چینی کریں۔ اور ایسا کرنے کے لئے کسی زیادہ ذہانت یا کمال کی بھی ضرورت نہیں۔ اور ایسا کرنا حقیقت میں ایک بہت ہی عام پسند اور تسلی بخش طریق وقت گذاری کا ہے اور ہم میں سے اکثروں نے کسی نہ

کسی وقت ایسا کیا بھی ہے تاہم امتحانات کا وجود باقی ہے بلکہ اس میں اضافہ بھی ہوگیا ہے محض
اس لئے کہ (ہماری تمام نکتہ چینیوں کے باوجود) ان کی ضرورت ہے اور ہم انہیں ترک نہیں
کرسکتے۔ یہ انیسویں صدی کی جمہوریت اور تصورات فضیلت کے ترکہ کا جزو ہیں۔ جس کسی کو بھی
مضمون امتحانات سے دلچسپی ہو۔ مناسب ہوگا کہ وہ مسٹر ونٹیبل کے ان دونوں کتب کا مطالعہ
کرے جو اٹھارویں صدی میں کیمبرج یونیورسٹی کی نسبت لکھے گئے تھے یا کوئی اور کتاب کا
مطالعہ کرے جس میں قدیم جامعات کا حال لکھا ہوا ہے۔ اس زمانہ کے قبل کا جب کہ علم اور
قابلیت کو پرکھنے کے بہت بے احتیاط طریقہ مروج تھے۔ جامعاتی تعلیم غیر موثر نہیں تھی محض
اس لئے کہ کوئی باقاعدہ امتحانی طریق نہیں تھا لیکن کوئی جامعاتی اصلاح بغیر کسی تشفی بخش طریقہ
تشخیص ذہانت ومحنت کے موثر نہیں ہوسکتی۔ یونیورسٹی اور خدمات ملکی میں امتحانی سسٹم ہی
واحد ذریعہ تھا جس سے ملک کو قدیم رواج یافتہ جانب داری اور خرابی سے نجات مل سکتی تھی۔
ملکی خدمات اور دیگر عہدوں پر سفارش واثر کے تحت نامزدگی کے قدیم طریق پر بہت کچھ کہا جاسکتا
ہے۔ بالکل اس طرح جیسا کہ ۱۸۳۲ء سے پہلے کے قدیم پارلیمنٹری انتخاب کے سسٹم کی نسبت لیکن
ان لوگوں کو جو ملازمتوں کے دلدادہ نہیں ہیں۔ تسلیم کرلینا چاہئے کہ امتحانی سسٹم جمہوری اداروں
کی تاریخ کا ویسا ہی نمایاں وظاہر حد فاصل ہے جیسا کہ ۱۸۳۲ء کا قانون اصلاح یا واجبی
جانب داری چند غیر معمولی قابلیت کے لوگوں کو بھی صف اول میں لاسکتی ہے جس طرح کہ وہ
اوسط قابلیت کے لوگوں کو نمایاں جگہ دیتی ہے اس طرح امتحانات بھی تمام عالی دماغ لوگوں کا
پتہ لگانے میں ناکام رہ سکتے ہیں۔ اس بات کو بھی تسلیم کرلینا ضروری ہے کہ امتحانات ایک
حد تک مصنوعی قابلیت پیما کا کام دیتے ہیں اور اس وجہ سے بے ضابطگیاں بھی واقع ہوتی ہیں
یہ بہت ہی غیر معمولی قابل یا اس کے برعکس کمزور طبیعت امیدوار کے لئے لازماً موزوں نہیں
ہوتے۔ ایک مشہور مصور اپنے بچپن میں ایک اسکول سرٹیفکٹ حاصل کرنے میں اپنی ریاضی اور
طبیعی کی کامل ناقابلیت یا طبیعت کے بہت حساس واقع ہونے کی وجہ سے ناکام ہوسکتا ہے۔

لیکن یہ حقیقت نہ اس کی مصوری کی شہرت کو کم کر سکتی ہے اور نہ امتحانات کی قدر کو۔ اسی طرح
ممتحنین بھی انسانی کمزوریوں سے مبرا نہیں۔ ان کے بھی قصور دماغی کے اوقات ہوتے ہیں۔
لیکن یہ طریق اصل میں عام امیدواروں کے لئے ہے اور انسانی ذرائع سے ہی اس کا سرانجام
چاہئے۔ ذہین و طباع اشخاص تو امتحانات چاہے رائج ہوں یا مسدود کر دئے جائیں اور امتحانی
کمیٹیاں۔ تلون مزاج ممتحنین کے خدمات سے دست بردار ہو جائیں اپنی خاص روش پر
چلتے ہی رہیں گے۔ لیکن اگرچہ جانچ و تحقیق میں کتنی ہی غلطیاں کیوں نہ ہوں وہ جانچ و تنقیح ہی
رہے گی اور اس کا رہنا نہیں رہنے سے بہتر ہے۔ امتحانات بیجا طرف داری کے محافظ بنے رہے
ہیں۔ اور آئندہ بھی رہیں گے۔ امتحانات کمیونٹی کو ایک مساوی الدرجہ فائدہ پہونچاتے ہیں
یعنی وہ ناقابلیت کے سد راہ بنے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض ناقابل لوگ ان امتحانات کے
موجودگی کے باوجود افسر جہاز صیغہ ہائے بیمہ کے منتظم اجازت یافتہ محاسب اور بیرسٹر بن جائیں
اور قابل و لائق لوگ پیچھے رہ جائیں یعنی انفرادی بے انصافی کا عمل ہوا ہو لیکن کمیونٹی (جماعت)
افرادیت سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور کوئی شخص یا کم از کم کوئی ایسا شخص جو سمندری
سفر کرتا ہو یہ تجویز پیش نہیں کر سکتا کہ تجارتی بورڈ سرٹیفکٹ برخواست کر دیا جائے اور وہ
بھی اس لئے کہ ممتحنین خطا پذیر ہیں۔ لیکن امتحانات ناقابلیت سے ہمیں محفوظ رکھنے سے بھی بڑھ کر
ہمارے حق میں مفید ثابت ہوتے ہیں وہ ذکاوت طبع کے اسٹانڈرڈ کو قایم رکھنے یا اس کو
ترقی دینے میں بہت ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں مثال کے طور پر ہم صرف ایک تمثیل پیش کریں گے
ہائر سکول سرٹیفکٹ امتحان کی موجودگی نے یونیورسٹیوں کو مدارس ثانویہ کے کام کی جانچ و تنقیح سے
بے نیاز کر دیا امتحان مذکور کی عدم موجودگی میں خود ان ہی کو اس کا سرانجام کرنا پڑتا تھا اور
اس طرح ابتدائی تعلیمی کام میں بھی انہماک کے عوض ان کے لئے زیادہ اہم و اعلیٰ کاموں میں
مصروفیت ممکن بنا دی۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ امتحان سے بھی حقیقت میں زیادہ اہم مدرسہ کا وہ
اعلیٰ کورس ہے جو ہائر اسکول سرٹیفکٹ تک رہبری کرتا ہے تاہم جامعات کے لئے اس بات کے

قطعی وکامل یقین کی ضرورت ہے کہ یہ کورس باقاعدہ اور بالکل مکمل رہا ہے اور اس امر کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ صرف اسی مقصد کے تحت ہم میں سے بہتوں نے اہمیت کے ساتھ احساس کیا ہے کہ میٹرک کی قابلیت کی جانچ اوسطاً ایک امتحان سے کی جانی چاہیئے جو کہ لڑکے کی عمر کے سترھویں یا اٹھارویں سال لیا جانا چاہیئے نہ کہ سکول سرٹیفکیٹ کے ذریعہ جو دو سال قبل عطا کیا جاتا ہے۔

امتحانات کی موافقت میں ایک اور اہم اور قابل غور بات ہے جس پر بھی توجہ دیجانی چاہیئے، عام لوگ امتحانات کا محض اس وجہ سے خیال کرتے ہیں کہ ان کے نتیجہ کے طور پر کامیابی کے انعامات وظائف۔ اسناد مستثنیات وغیرہ حاصل ہوتے ہیں لیکن ذہنی تربیت کے نقطۂ نظر سے کامیاب اور ناکام امیدواروں پر ان کا جو اثر مترتب ہوتا ہے اسے مساویانہ طور پر نظرانداز کر دیا جاتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ نتیجہ پر زور دیا جاتا ہے نہ کہ اس کے حصول کی کوشش پر۔ غالباً وہ لوگ جن کے ذمہ ایسے بچوں کی تربیت ہوتی ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے مدرسہ کے معمولی نصاب سے ہوکر نہیں گذرے اس ذہنی تربیت کی اعلیٰ قدر کو بنظر امعان دیکھتے ہیں جو محصلہ علم کو زیادہ سخت تنقید کے لئے پیش کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور جس سے ان کے شاگرد محروم رہے۔ ایسے حالات میں ان کا علم غیر مربوط۔ نیم فہمیدہ۔ پریشان اور ان کے لئے ناقابل استعمال رہ سکتا ہے۔ جب ایک بار امتحان کا عمل ہوتا ہے تو یہ سب کمزوریاں بہت آسانی وکامیابی کے ساتھ اکثر دور ہو جایا کرتی ہیں مختصراً یہ کہ امتحانی سسٹم پڑھنے کے سست طریقوں کو روکتے ہیں۔ اور اگر پرچہ جات سوالات صحیح طور پر مرتب ہوں تو اپنے خیالات کے اظہار اور صفائی کرنے کی ترغیب ہوتی ہے امتحانی سسٹم کے طرف داروں میں دلائل قوی آسان اور ظاہر ہیں اور چونکہ امتحانی سسٹم بہت مستحکم ہے اس لئے عوام کے مسلسل سخت اعتراضات کے باوجود ان کا وجود باقی و قائم ہے اور بلاشبہ وہ اس قدر آسان اور ظاہر ہیں کہ وہ اکثر بلا اظہار ہی رہ جاتے ہیں۔ پس یہ ان وجوہات اور نیز دیگر معقول وجوہات کی بناء پر ہی ہے کہ

وہ لوگ بھی جو طرز و طریق امتحانات پر سخت تباہ کن اعتراضات کرتے ہیں۔ طریق امتحان کو بالکل بند کرنے کی رائے دینے سے احتراز کرتے ہیں اور ایسا اس وقت بھی جب کہ یہ مقدمہ کا منطقی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اس رسالہ کے مصنفین نے ان وجوہات کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے لیکن تنقیح امتحانات میں انہوں نے کافی معقولیت کا اظہار کر دیا۔

اب ہمیں رسالہ کے ان بیانات پر محققانہ نظر ڈالنی چاہیے جن سے کہ واقعات کا انکشاف ہوتا ہے اولاً یہ کیا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے جو ایک بڑے امتحانی ادارے کے انتظام سے متعلق رہے ہوں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اور نہ ان صفحوں میں کوئی ایسی نئی بات ہے جس سے عرصہ دراز سے وقفیت حاصل نہ ہوئی ہو۔ اور تجارب جو معقول طور پر کئے گئے ہیں ان کے اخذ کردہ نتائج بھی ویسے ہی ہیں جیسے کہ ہوتے چاہئے اور جن کی نسبت پہلے ہی سے خیال آرائی کی گئی تھی اولاً امتحان کے نسبت چند حقایق ایسے ہیں جو اصولی ہیں۔ انسانی ہستیاں کلیں نہیں ہیں جو بے خطا فیصلے کرتے ہوں بس اس ناگریز حقیقت کو تسلیم کر کے ہمیں اس کا بہترین مصرف نہ صرف امتحانی کاموں میں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں کرنا چاہئے اصحاب۔ جو ایسی بھی غلطیاں کر سکتے ہیں اور انسانوں کے جانیں بھی ان غلطیوں کے نذر ہو سکتی ہیں لیکن ہم ان وجوہات کی بناء پر عدالتوں میں اپنی قابلیتوں کے حد تک انصاف کرنے کی کوششوں سے باز نہیں آ سکتے۔ جہاز راں غلطیاں کر سکتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر صدہا جانوں پر بن بھی جاتا ہے لیکن ہم اس سدا موجود امکان کے خوف سے سمندری سفر ترک نہیں کر دیتے۔ اب امتحانوں کے متعلق اندازہ کرنے کا طرز جوری اور جہاز رانوں کے طریقہ اندازہ سے بہت پیچیدہ ہے کیونکہ ممتحن کو نہ صرف حسب قاعدہ واقعات تحریر کردہ کے نسبت طے کرتا ہے بلکہ ان کی صفتوں کی بھی تشخیص کرنی ہے اسی شخص کو جوابی پرچہ کے ذریعہ اس کے جواب تحریر کرنے والے کی قابلیت کی جانچ کرنی ہے جس سے وہ محض ان جوابی پرچوں کی تحریر کے ذریعہ واقف ہوتا ہے اور جہاں کہیں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ معلومات کے بغیر صفات کی تشخیص کی جائے اور خاص کر

اس وقت جب کہ ان تمام الفاظ پر غور کرنا ہے جن سے طرز تحریر منطبق ہوتا ہے تو آراء کے
اختلافات لابدی ہوں گے۔ ہم فنون اور ادب کی تحریروں کی نسبت مکمل اتحاد رائے و
یکسانیت تشخیص کی امید نہیں کر سکتے اور پرچہ جات امتحان کی نسبت ایسی امید کرنی بالکل
مضحکہ خیز بھی ہے۔ نیز ہم اپنے ماہرین سے ان کے خاص مضامین میں بھی جب کہ ہمارا تجربہ
مشاہد ہے اس کی نسبت کم سے کم توقع نہیں کر سکتے۔ حقائق و واقعات کی نسبت صحیح رائے
دینے کے لئے ماہران علم کی بہت ضرورت ہے لیکن ماہران کی رائے بڑی حد تک انفرادی
ہو سکتی ہے پس ان حقائق کو تسلیم کرنے کے بعد بعض وقت یہ بات زیر بحث لائی جاتی ہے
کہ ہمیں صرف واقعات کے علم کی جانچ کی حد تک اکتفا کرنا چاہئے اور یہ وسیع تحریک ہے کہ
کسی حال انصاف و یکسانیت سلوک کے لئے کبھی پیش نہیں کی جانی چاہئے۔ حافظہ کی شہادت پر
غور کرنا اور خیال کرنا و تصور کو نظر انداز کر دینا۔ محنت کا صلہ دینا۔ لیکن فکر کا لحاظ نہ کرنا
محنت کا حوصلہ رکھنا لیکن اس کے استعمال کی طاقت نہ رکھنا ناانصافی اور بیہودگی کی انتہا
ہے۔ اس بات کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ جس قدر صنعت ارفع و اعلیٰ ہو گی اسی قدر اس کی
حقیقی قدر کی تشخیص دشوار تر ہو گی اور یہ صریح نتیجہ درست ہے کہ صنعت جس قدر بیش بہا
ہو گی اسی قدر اس کی ٹھیک طور پر معرفت کی کوشش مشکل و اہم تر ہو گی۔ ہمیں مشکلات کا سامنا
کرنا ہے ان کے آگے سے بھاگ نہیں جانا چاہئے۔ اور نہ ہمیں بزدلی کے ساتھ قرار دینا چاہئے
چونکہ وہ بہت مشکل مراحل ہیں۔ ہم ان کے مقابلہ کی کوشش نہیں کر سکتے۔ بلکہ عاقلانہ طور پر
سمجھنا چاہئے کہ ہم کسی مشکل کام کی کوشش غلطی کے بغیر نہیں کر سکتے۔ بہترین کام جو ہم کر سکتے ہیں وہی
کرنا چاہئے اگر ہمیں ایسے ممتحن جو فیصلہ و تشخیص میں غلطی نہیں کرتے نہیں مل سکتے تو کم از کم ہمیں
ایسے ممتحنین مل سکتے ہیں جو راست بازانہ فیصلہ کر سکتے ہیں راست بازی علم و تجربہ۔ یہ تینوں
چیزیں دستیاب ہو سکتی ہیں لیکن ایک امتحان کے صریح انعقاد کے لئے انفرادی ممتحنوں میں
کسی حد تک بھی ارفع ترین صفتیں کافی نہیں ہو سکتیں اور یہی وجہ ہے کہ کمیٹی نے جس قدر

تجربے کئے ان کا بڑا حصہ دور ہی رہا۔ ممتحنین معمولی مکمل آزادی کے ساتھ اپنے فرائض انجام نہیں دیتے اپنے چھوٹے ماحول میں زندگی گذارتے اور اپنی فاش کمزوریوں یا پابندیوں کے بے چارے شکار ہیں۔ اگر وہ غلطی کرتے ہیں تو ان کو ان غلطیوں کی تلافی کے کچھ موقع بھی دئے جاتے ہیں یا بالفاظ دیگر وہ علیحدہ افراد کی طرح کام نہیں کرتے بلکہ ایک ٹیم ( ) کی طرح کام میں لگے ہوتے ہیں۔ باہمی ارتباط و تبادلہ خیالات ممتحنوں کے ضروری خصوصیات ہیں یا ہونا چاہیئے۔ یہ ممتحنوں کے ان اختلاف آراء کے بچاؤ کے لئے سادہ ابتدائی لیکن بہت ہی پر اثر طریق عمل ہے جس کا ذکر اس رپورٹ میں اس شدومد کے ساتھ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ فی الحقیقت تعجب خیز ہے کہ اس رپورٹ کے صفحات میں اس آسان و سادہ علاج ارتباط باہمی کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے اور ہمارا تعجب اس لئے بھی زیادہ ہوجاتا ہے کہ اس طریق عمل پر کام کرنے کی اب سفارش نہیں کی جارہی ہے بلکہ اس پر عمل بھی برابر ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے اور تجربہ نہایت وسیع پیمانہ پر ثابت کرتا ہے کہ یہ طریق عمل کس قدر پر اثر ضمانت ہے جب ہم آزمائشی سٹری آنرس امتحان کے عطا شدہ نمبروں کے اس وسیع اختلاف و فرق کو دیکھتے ہیں جو اس رسالہ میں مذکور ہے تو ہمیں اولاً تعجب کا احساس ہوتا ہے اور ہمارا اولین خیال یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح ان نتائج کے مدنظر ایک سلسلہ درجہ (RANK) کی فہرست حاصل کی جاسکتی ہے۔ پھر مختلف جامعات کے امتحانوں کے نسبت اپنے ذاتی اور دوسروں کے تجربہ کی بناء پر یاد آتا ہے۔ ایک منتق طور پر تعلیم کا بڑا درجہ (RANK) کی فہرست تیار کرنا شاذونادر ہی مشکل کام ثابت ہوا ہے اور اہم تر بات یہ ہے کہ اگر یہ ہمیشہ مد نظر ہیں ایسے امیدواروں کی اہل ہیں جو حیرت انگیز طور پر امتحانوں میں اعلیٰ نمبر پاتے ہیں یا بہت ہی ادنیٰ تاہم یہ فہرستیں تقریباً حقیقتاً ان امیدواروں کی ہمارے اندازے کے برابر اترتی ہیں جن کو ہم جانتے ہیں اور جن کے متعلق ہم نے قبل از قبل اندازہ بھی قائم کرلیا ہے اور جو ان کے آئندہ زندگی نے ثابت بھی ہوتا ہے

ایسی حالتوں میں تجربے کے فیصلہ اور اس آزمایش کے درمیان نمایاں فرق ظاہر ہوتا ہے ایک حقیقی جامعاتی امتحان کا نہایت اہم جزو ہے جس کو اس آزمائش میں نظر انداز کیا گیا ہے یعنی ممتحنوں کا آخری تبادلہ خیال۔ پرچہ جات جوابی کا اسی ممتحن سے اور دوسرے ممتحنوں سے مکرر جانچا جانا اور پھر اختلاف آراء کے موقع پر باہمی تبادلہ خیالات سے معیار کا برابر کیا جانا داخلی ممتحنوں سے امیدوار کے سال بھر کے کورس تعلیم کے سابقہ ریکارڈس کی نسبت اس شہادت کو حاصل کر کے جوان موقع پر حقیقی طور پر فراہم کی گئی ہے مشتبہ پرچہ جات کی نسبت معیار کا قائم کرنا امتحان کے اس اسٹیج سے زبانی امتحانوں کا بھی تعلق ہے اور اکثر جامعات میں تمام آنرس کے امیدوار اور ایسے امیدوار جو خط سرحدی کے کامیاب شدہ) بالکل ضروری نمبروں سے کامیاب ہونے میں ایسے ہی امتحان کے لئے طلب کئے جاتے ہیں۔ امیدوار کے حاضر ہونے کے بیشتر پرچہ جات جوابی کی مکرر خواندگی اور آراء کا باہمی تبادلہ عمل میں آتا ہے اور زبانی امتحان کے بعد قطعی فیصلہ کیا جاتا ہے مکرر نمبر اندازی اور امیدوار کے کام کے نسبت تبادلہ خیال۔ اور نمبروں کے بڑھانے (نہ کہ کم کرنے) کے مزید مواقع زبانی امتحان کے ذریعہ رہنے کی اہمیت کو خارج یا نظرانداز کرتے ہوئے کمیٹی نے اپنے آزمائشی نتائج کے اس حصہ کو قابل لحاظ نظر اندازی سے بگاڑ دیا یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ تاریخی سوالات کے جوابات کسی ایسے زمرہ میں رکھے جاتے ہیں جس کو تجربہ کار ممتحن عموماً بلا تکلیف پہچان سکتے ہیں۔

(۱) کامل جواب۔ واضح جس سے غور وجدت ظاہر ہو۔

(۲) جواب جس میں معلومات کم بہم پہونچائے گئے ہیں۔ لیکن جس میں دیگر خوبیاں اول الذکر قسم کی موجود ہیں۔

(۳) جواب جو تقریباً معلومات سے بھرا ہوا ہے لیکن جس سے جدت طبع یا تنقیدی قوت کی کمی پائی جاتی ہے۔

(۴) کافی لیکن معمولی جواب۔
(۵) نامکمل اور کچھ غلط جواب جس میں چند خوبیاں ہوں۔
(۶) کمزور لیکن ایسا جو بالکل بیہودہ نہ کہا جا سکے۔
(۷) بالکل ناقابل قبول جواب۔

ان زمروں پر حملہ۔ الف تا د نمبر حاوی ہیں (سو فیصد تا صفر) اور کسی قسم کا یکسانیت معیار حاصل کرنے کے قبل باہمی اتفاق سے امتحان بورڈ چاہیے کہ نمبر اندازی کے پیشتر ہر ایک قسم کے زمروں کی تعداد علٰحدہ کر لے۔ اس رپورٹ کے صفحات (۲ و ۱۷) کے متعلقہ ضمیمہ الف سے ظاہر ہے کہ ایسا نہیں کہا گیا۔ اور یہ دیکھا جائے گا کہ اسی اصولی وجہ کی بنا پر کامل تنقیح بگاڑ دی گئی۔ فی الحقیقت یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ "حقیقی پراکٹس (عمل) سے بہ ظاہر معلوم ہے کہ جماعت کے قابلیتی معیار کے حدود کسی خاص مصنوعی طریقہ پر مقرر نہیں کئے گئے ہیں۔ لیکن ضروری نمبروں سے پاس ہونے والوں کے مضامین زیر بحث لائے جانے کے لئے۔ ایسے ہی حدود مقرر ہیں (صفحہ ۲۷) لیکن مستعملہ علامات کے کسی تسلیم کردہ مفہوم کے بغیر جس کا تصفیہ قبل از قبل کر لیا جانا چاہیے۔ یہ دیکھنا مشکل ہے کہ کس طرح یکسانی خیال کی توقع کی جا سکتی ہے۔

غالباً یہ صحیح ہے کہ ایک یونیورسٹی میں جہاں ایک یا دو ممتحن باہر کے لوگ اور پانچ یا چھ مابعد کے ہی استاد ہوتے ہیں اور تعداد امیدواران امتحان اوسط ہوتی ہے تو امتحانی حالات حسب توقع نصب العین کے قریب ترین ہوتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ایک اسکول کورس (امتحان) میں حالات بالکل اس لئے برعکس ہوں گے۔ جہاں امیدواروں کی تعداد ہزاروں تک پہونچ جاتی ہے اور جن کے پرچوں کی تنقیح بیسیں یا اس سے زاید ہی ممتحن مقرر ہوتے ہیں۔ ان حالات کی صورت میں معیار قائم کرنے کے لئے احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اور ناظرین کے لئے اس بات کا معلوم کرنا

باعث دلچسپی ہوگا کہ ایک بہت بڑے امتحانی بورڈ نے نمبروں کو یکسانیت کے تحفظ کیلئے کیا طریقے اختیار کئے۔ جامعیات مانچسٹر، لیورپول لیڈس شفیلڈ اور برمنگھم نے سالہا سال سے اس مسئلہ پر غور جاری رکھا ہے جس کو کمیٹی تحقیقات کر رہی ہے۔ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو چکی ہے اور بہت سی شہادتوں کی روشنی میں جو اس نے خود ہی مہیا کئے ہیں۔ اس نے اپنے خاص طریق کار کو سوچ لیا ہے جس کی ہمیشہ اصلاح و ترقی جاری رہتی ہے کہ صحیح معیار حاصل و قائم رہے۔ اس کی کامیابی اولاً بہت کچھ پرچہ سوالات کی ترتیب پر منحصر ہے۔ اگرچہ چند اشخاص جن کا انتخاب یوں ہی کیا گیا ہے اور جنہوں نے پہلے ہی پرچہ سوالات کا مطالعہ نہ کیا ہو تو جوابات کی تنقیح کے لئے یہ یقین ہے کہ ان میں کا ہر ایک پرچوں کی جانچ کا علحدہ علحدہ ہی اصول اختیار کرے گا۔ اس لئے بورڈ پرچہ سوالات مرتبہ کے مضمون پر انتہائی توجہ دیتا ہے؛ وراس بات پر اس کو اصرار ہے کہ تمام ممتحنین متحد طور پر اس سے کامل واقفیت رکھیں۔ سب سے پہلے ان کے لئے ضروری ہے کہ جوابی پرچوں کو تنقیح و نمبر اندازی کے قبل سوال کے ایک ہی معقول جواب پر متفق ہو جائیں۔ اس سے پیشتر کہ ہم ان ذرائع پر غور کریں جن کی بنا پر ایسا ہو سکا ہے ہمیں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ سکول سرٹیفکٹ کے مختلف مضامین کے پرچہ سوالات جو بورڈ نے ترتیب دئے جدید طرز کے تھے یا نہیں۔ پرچہ سوالات تاریخ میں منجملہ ۸ کے تین سوال آسان اور عام معلومات امیدواروں کی بالراست تنقیح کے لئے تھے جن کا جواب دو یا تین الفاظ میں ادا ہو سکتا تھا اور جن کو نہایت آسانی سے حساب کے جواب کی طرح درست یا غلط تصور کیا جا سکتا تھا پرچہ سوالات دو تجربہ دار ممتحنوں سے مرتب ہوتا ہے جن میں کا ایک خود معلم ہوتا ہے پھر اس پرچہ کو ایک نظر ثانی کرنے والے کے پاس پیش کیا جاتا ہے جو وہ بھی مدرس مدرسہ ہوتا ہے۔ اس کو اطمینان کرنا پڑتا ہے کہ سوالات بالکل واجبی اور مناسب ہیں اس کے بعد یہ شخص بورڈ کی خدمت میں ایک

رپورٹ پرچہ سوالات کی نسبت پیش کرتا ہے جس میں پندرہ سوالات کے جواب بھی ہوا کرتا ہے کہ پرچہ کا معیار معلوم ہو سکے اور اس کا بھی اندازہ ہو سکے کہ الفاظ مبہم اور ذو معنی نہیں بلکہ صاف اور واضح ہیں۔ اس کے بعد تاریخ اور بہت سے دیگر مضامین کے پرچہ جات سوال بورڈ کی ایک خاص کمیٹی میں بغرض تنقید، تبصرہ پیش ہوتے ہیں جس کے بعد وہ امیدواروں کو حل کرنے کے لئے دئے جانے کے قابل سمجھے جاتے ہیں۔ اس جلسہ میں کمیٹی کے پاس صدر ممتحن کے تمام سوالات کے مفروضہ جوابات کا خاکہ یا خلاصہ بھی ہوتا ہے۔

پھر جب پرچہ جات سوالات اس آخری آزمائش و تنقید سے گذر جاتے ہیں تو صدر ممتحن نمبر اندازی کا ایک تفصیلی اسکیم مرتب کرتا ہے کہ اس کے دیگر ساتھیوں کو رہبری ہو سکے امتحان کے دن۔ دفتر بورڈ میں پرچہ جات جوابی کے وصول ہونے ہی صدر ممتحن دس ایسے پرچہ جات جواب منتخب کرتا ہے جن کے متعلق اس کی رائے ہوتی ہے کہ بالکل کامیابی کے خط سرحدی کے معین یا معیار کے قرار دینے اور نمبر اندازی کے دیگر مسائل کے حل کرنے کے قابل ہیں ان دس پرچوں کے عکس نقول لیئے جاتے ہیں کہ ہر ایک ممتحن کے پاس ان کا ایک سٹ رہے دو دن کے بعد جملہ ممتحنوں کا ایک کانفرنس ہوتا ہے اس اثناء میں ہر ایک ممتحن کم از کم ۲۵ پرچوں کو تنقیح کر لیتا ہے کہ اپنے کام کا اندازہ کر کے اپنی مشکلات اور اپنے خیالات پر آپس میں بحث کر سکیں اور چونکہ ممتحنوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے آٹھ نو سو پرچے جانچے جاتے ہیں اور اس کام کے اثناء میں ممتحنوں کو جن جن باتوں کا تجربہ ہوتا ہے انہیں زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اس کانفرنس میں ان دس عکس نقول لئے ہوئے پرچوں کو بھی کام میں لایا جاتا ہے اس کا عام طریق یہ ہے کہ صدر کانفرنس پہلے تین پرچوں کا سوال بہ سوال مطالعہ کر دیتا اور ایک ممتحن سے پوچھتا جاتا ہے کہ وہ کس قدر نمبر اس کے دے گا اختلاف خیال پر فی الفور بحث ہوتی ہے اور ایک متحدہ طور پر منظورہ نمبر ہر ایک جواب کو دیا جاتا ہے اس کے بعد بقایا جوابی کاپیوں کی

آزادانہ طور پر ایک ممتحن جانچ کر لیتا ہے آخر میں اس آخری طریق عمل سے معیار کا جو تفاوت پایا گیا اس کو نوٹ کیا جا کر اس پر بحث کی جاتی ہے۔ جلسہ کے ختم پر ہر ایک ممتحن اپنے سابقہ وہ دس جوابی پرچہ جن کے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے لیجاتا ہے کہ باقی کام کی انجام دہی میں ان سے ہدایت حاصل کر سکے جب اپنا کام ختم کر دیتا ہے ایک کاغذ پر اپنے طریق نمبر اندازی کی تفصیل لکھ بھیجتا ہے ساتھ ہی اس کے (۲۵) پرچہ جات جوابی منتخبہ از بیان دفتر جس کی وہ تنقیح کر چکا ہے۔ صدر ممتحن کے پاس بھیج دیتا ہے جس سے اس کو (صدر ممتحنین) معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی نے مقررہ معیار نمبر اندازی سے اختلاف کیا ہے اگر کسی نے ایسا کیا ہے تو پرچہ جات جوابی کی مکرر نمبر اندازی ہوتی ہے یا صدر نمبران میں نمبر درست کرائے جاتے ہیں صدر ممتحن کا کام اس تمام طریق عمل میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن نتائج یقیناً اطمینان بخش ہوتے ہیں معیار کا فرق بڑی حد تک دور ہو جاتا ہے پس جب ممتحنوں کا اتحاد عمل اور متفقہ کام کے ایسے واضح طریقہ استعمال کئے جاتے ہیں تو اس وقت دعویٰ کیا جا سکتا ہے اسکول سرٹیفکیٹ سے امتحان مضمون تاریخ کے پرچوں کی نمبر اندازی استواری کا درجہ رکھتی ہے۔ (باقی آئندہ)

نقش کشی کی آسانیاں